Regd. L. No.7243

Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اپریل 1977

اس پرچہ میں

قائداعظمؒ — اور — قرآن مجید

اگلے پرچہ میں

اسلامی مملکت کا تصور — اقبالؒ کے نزدیک

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلی فون نمبر	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان ۔۔۔ ۱۸ روپے غیر ممالک ۔۔۔ ۳ پونڈ	۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام - گلبرگ ۲ - لاہور	۱ ½ ڈیڑھ روپیہ
جلد ۳۰	اپریل ۱۹۷۷ء	شمارہ ۴

فہرست

۱- لمعات ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲

۲- قائدِ اعظمؒ ۔۔۔ اور ۔۔۔ قرآن مجید ۔۔۔ (پاکستان کی اصل و بنیاد) ۔۔۔۔۔۔ ۹

(محترم پرویز صاحب کا "یوم پاکستان" کی تقریب پر خطاب) ۔۔۔۔۔۔

۳- معرکۂ دین و وطن ۔۔۔۔۔۔۔ (محترم پرویز صاحب) ۔۔۔۔۔۔۔

۴- حقائق و عبر ۔۔۔۔۔ (۱) "مسیحِ موعود" قادیانی کی اُمت ۔۔۔۔۔۔۔ ۵۲

(۲) قائدِ اعظمؒ کے سوانحِ حیات اور مغربی مصنفین ۔۔۔۔۔۔

(۳) صرف نام کی تبدیلی ۔۔۔۔۔۔

۵- نقد و نظر ۔۔۔۔ (۱) "CONSPIRACIES AGAINST THE QURAN" ۔۔۔ ۵۷

(۲) "اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات" ۔۔۔۔۔۔

ایڈیٹر محمد خلیل - ناشر سراج الحق - مقام اشاعت ۲۵ - بی گلبرگ ۲ لاہور - پرنٹر شیخ نیاز احمد - مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ہسپتال روڈ - لاہور۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

پابندیٔ وقت طلوعِ اسلام کی مستقل روایت چلی آ رہی ہے۔ یعنی اس کا ہر اشاعت پہلی تاریخ کو حوالۂ ڈاک کر دیا جاتا ہے۔ اس کی ساری زندگی میں چند ایک مواقع ایسے آئے ہیں جن میں یہ روایت قائم نہ رہ سکی۔ انہی میں ماہِ مارچ کے پرچہ کی ترسیل کا واقعہ بھی شامل ہے۔ اُسے ہم ۹ مارچ سے پہلے پوسٹ نہ کر سکے۔ اس دوران میں قارئین کی طرف سے جس کثرت اور جس مضطربانہ انداز سے پرچہ کے نہ ملنے کے متعلق استفسارات موصول ہوئے، ان سے یہ اندازہ ہوا کہ قارئین کو اس کا کس شدت سے انتظار رہتا ہے اور انہیں اس سے کس قدر قلبی لگاؤ ہے۔ اِس تاخیر کی وجہ سے انہیں جس قدر پریشانی ہوئی اس کے لئے ہم دلی معذرت پیش کرتے ہیں۔

یہ زمانہ انتخابات کی معرکہ آرائیوں کا تھا۔ ہمیں اس سلسلے میں بھی بکثرت استفسارات موصول ہوئے کہ ہم اِن ہنگامہ آرائیوں اور ان کے نتائج پر اپنا تبصرہ جلد شائع کریں۔ اگر ہمیں یہ استفسارات موصول نہ بھی ہوتے تو بھی ہمارا یہ فریضہ تھا کہ ہم اِن واقعات کا تجزیہ کرتے اور قوم کے سامنے اس کا ماحصل پیش کرتے، کیونکہ یہ واقعہ بڑا اہم تھا اور ہماری مملکت کے مستقبل پر اس کا بڑا گہرا اثر۔ ہمارا ارادہ تھا کہ اشاعتِ حاضرہ میں یہ تبصرہ پیشِ خدمتِ قارئین کیا جائے لیکن اس باب میں پھر ایک دشواری لاحق ہو گئی۔ طلوعِ اسلام جو کچھ پیش کرتا ہے اس سے مقصد نہ ہنگامہ آرائی ہوتا ہے نہ اشتعال انگیزی۔ وہ قوم کو سوچنے کی دعوت دیتا ہے اور اسی مقصد کے لئے ہر پیش آمدہ واقعہ پر تبصرہ کرتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اِس وقت ملک میں ایسے حالات رونما ہو چکے ہیں جن میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو جایا کرتی ہیں۔ اس وقت الیکشن کے نتائج کے خلاف عملی مظاہرے ہو رہے ہیں جو سول نافرمانی کی شکل اختیار کر رہے ہیں۔ اِن حالات میں ایسے حقائق پیش کرنا جن پر گہرے غور اور تدبّر کی ضرورت ہو، عبث ہے۔ اس کے لئے مناسب وقت وہی ہو سکتا ہے جب فضا میں سکون ہو اور قوم کے جذبات اعتدال پر آ جائیں۔ ہنا بریں، ہم اپنے تجزیہ اور تبصرہ کو اُس مدت تک کے لئے ملتوی کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ ہماری یہ بھی دشواری ہے کہ پرچہ کے بروقت چھپنے

کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ بیس تاریخ تک پریس میں بھیج دیا جائے۔ اس وجہ سے بھی ہمارے پاس اتنا وقت نہیں کہ ہم فضا میں سکون پیدا ہو جانے تک کا انتظار کر سکیں۔ لہٰذا اسے سردست ملتوی کر دینا ناگزیر ہے۔ البتہ ایک نکتہ ایسا ہے جس کے متعلق ہم بلاتاخیر اپنے تاثرات پیش کر سکتے ہیں۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک اس وقت ملک میں کوئی پارٹی اور کوئی جماعت ایسی نہیں جس کے ہاتھ میں زمامِ اقتدار آنے سے وہ مقصد پورا ہو سکے جس کے لئے اس خطۂ زمین کو حاصل کیا گیا تھا --- اسے حاصل اس لئے کیا گیا تھا کہ یہاں دین کا نظام قائم ہو سکے۔ تحریکِ پاکستان اس مقصد کے حصول کا ذریعہ تھی۔ اس تحریک کی سب سے شدید مخالفت مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ہوئی تھی جن کے نمائندے نیشنلسٹ علماء کہلاتے تھے۔ (جماعتِ اسلامی کی طرف سے مخالفت کو ہم متعدد بار پیش کر چکے ہیں)۔ ان نیشنلسٹ علماء کا دعویٰ یہ نہیں تھا کہ وہ ہندوستان میں ہندو دھرم رائج کرنا چاہتے تھے۔ ان کا دعویٰ بھی یہی تھا کہ وہ اسلام کا تحفظ چاہتے ہیں۔ اس سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب تحریکِ پاکستان کا مقصد بھی اسلامی نظام قائم کرنا تھا اور دوسری طرف، اس کے مخالف گروہ بھی اسلام ہی کا تحفظ چاہتے تھے تو پھر ان میں بنائے نزاع کیا تھی؟ یہ کیوں باہم دگر برسرِ پیکار تھے؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان دونوں گروہوں میں اسلام کے تصور کا اختلاف تھا۔ اور اختلاف بھی بڑا بنیادی! نیشنلسٹ علماء کا موقف یہ تھا کہ مسلمانوں کو اگر ان کے اعتقادات اور شخصی قوانین کے تحفظ کی ضمانت مل جائے تو اسلام کا مقصد پورا ہو جاتا ہے خواہ مملکت کا نظام کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ اس قسم کے نظامِ حکومت کو سیکولر کہا جاتا ہے۔ ہندو اس قسم کی ضمانت دینے کے لئے تیار تھا کیونکہ وہ وہاں سیکولر نظام رائج کرنا چاہتا تھا۔ اس کے برعکس تحریکِ پاکستان کا موقف یہ تھا کہ اسلام صرف چند معتقدات اور شخصی قوانین کا نام نہیں۔ اس کا نظام انسان کی پوری زندگی کو محیط ہے۔ جس میں پرسنل لاز اور پبلک لاز میں کوئی تفریق نہیں کی جا سکتی۔ اسلامی نظام (یا الدین) کا مقصود تکریمِ انسانیت ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی انسان، نہ کسی دوسرے انسان کا محکوم ہو، نہ محتاج۔ اس کے لئے ایک جداگانہ مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس مملکت کے مسلمان ایک اُمت کے افراد ہوتے ہیں جن میں نہ مذہبی فرقوں کا وجود ہوتا ہے نہ الگ الگ سیاسی پارٹیوں کی تفریق۔ یہ سب مسلمان، اُمتِ واحدہ کے افراد ہوتے ہیں اور سب ایک ہی ضابطۂ قوانین کے تابع زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ ضابطۂ قوانین قرآنِ مجید کے ابدی اور غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ہوئے، افرادِ امت کے باہمی مشورے سے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق وضع کیا جاتا ہے اور مملکت کی سنٹرل اتھارٹی کی طرف سے اس کا نفاذ ہوتا ہے۔ (اسلام کے صدرِ اوّل میں اسے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ سنٹرل اتھارٹی یا مرکزِ ملت سے مراد اسی نظام کی قوتِ نافذہ ہے)۔ تحریکِ پاکستان کے دوران اس تحریک کے حامیوں اور اس کے مخالفوں میں جو نزاع تھی وہ اسلام کے تصور کے متعلق اسی اختلاف کی جنگ تھی۔ تحریکِ پاکستان کامیاب ہو گئی اور مسلمانوں کو ایک ایسا خطۂ زمین میسر آ گیا جس میں وہ دین کا نظام قائم کر سکیں۔ اس ۲۵-۳۰ سال کے عرصے میں یہاں کیا کچھ ہوا، اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ یہاں صرف یہ بتانا

مقصود ہے کہ الیکشن سے متعلق محاذ آرائیوں میں ہر گروہ اسلام کا نام لیتا تھا، لیکن ان سے کسی کے سامنے بھی دین کے نظام کا وہ تصور نہیں تھا جس کے قیام کی خاطر تحریکِ پاکستان وجود میں لائی گئی اور یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا ـــــ ان میں سے ہر ایک کے سامنے وہی سیکولر نظام تھا جو غیر منقسم ہندوستان میں تحریکِ پاکستان کے مخالفین کی طرف سے پیش کیا جاتا تھا۔ الیکشن کی محاذ آرائیوں میں دو ہی ممتاز گروہ ایک دوسرے کے مقابل صفِ آرا تھے، یعنی پیپلز پارٹی اور اس کے بالمقابل پاکستان قومی اتحاد جو ایسی نو پارٹیوں پر مشتمل تھا جن میں الیکشن جیتنے کے سوا کوئی وجہِ اشتراک نہ تھی۔ چونکہ اس پارٹی کے سربراہ مفتی محمود صاحب تھے اس لئے ان کی طرف سے اسلام کا نام زیادہ بلند آہنگی سے لیا جاتا تھا ـــــ جہاں تک پیپلز پارٹی کا تعلق ہے وہ مذہبی پیشواؤں پر مشتمل جماعت نہیں۔ وہ (عرفِ عامہ میں) "مسٹروں" کی پارٹی ہے، اس لئے اگر وہ اسلامی نظام کا صحیح مفہوم نہیں سمجھتے ـــــ یا یوں کہئے کہ دین اور مذہب میں تفریق نہیں کر سکتے ـــــ تو وہ معذور سمجھے جا سکتے ہیں۔ اُن کے ذہن میں روشِ عامہ کے مطابق اسلام کا تصور، مذہب ہی کا ہے۔ ان کا نعرہ یہ ہے کہ اسلام ہمارا دین ہے۔ (شروع میں انہوں نے یہ کہا تھا کہ اسلام ہمارا مذہب ہے، بعد میں مذہب کے لفظ کو دین سے بدل دیا گیا تھا۔ لیکن یہ محض لفظی تبدیلی تھی کیونکہ مفہوم اس سے بھی مذہب ہی تھا۔) اسلام ہمارا دین ہے کے ساتھ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ جمہوریت ہماری سیاست ہے۔ اور سوشلزم ہماری معیشت ـــــ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک اسلام سے مراد چند اعتقادات، رسوم و مناسک اور پرسنل لاء ہی ہے۔ سیاست اور معیشت سے اس کا تعلق نہیں ـــــ اگر ان کے سامنے دین کا صحیح تصور ہوتا تو انہیں کہنا یہ چاہیئے تھا کہ اسلام ہمارا دین ہے۔ اس کی جمہوریت ہمارا سیاسی نظام اور اس کی معیشت ہمارا معاشی نظام ہوگا ـــــ اسی سے اسلامی نظام کی جامعیت ہمارے سامنے آ سکتی تھی۔ لیکن جب سیاست اور معیشت، اسلام سے الگ ہو جائیں تو پھر وہ دین نہیں رہتا، دیگر مذاہب کی طرح ایک مذہب بن کر رہ جاتا ہے۔ سیکولر اسٹیٹس (STATES) میں اسی قسم کا مذہب رائج ہوتا ہے۔

ان کے مدِمقابل قومی اتحاد میں بیشتر علماء حضرات موجود تھے، لیکن اسلام کے متعلق ان کا تصور بھی مذہب ہی کا تھا، دین کا نہیں۔ اور ایسا ہونا فطری امر تھا۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، اس گروہ کے سربراہ مفتی محمود صاحب تھے جو غیر منقسم ہندوستان میں نیشنلسٹ علماء کے زمرے میں شامل تھے۔ (اگر ہماری یادداشت غلطی نہیں کرتی تو یہ مولانا حسین احمد مدنی مرحوم کے شاگرد اور غالباً ان کے مرید بھی ہیں۔ اور کانگرس کے پروگرام میں ان کی رفاقت میں نمایاں حصہ لیتے تھے۔) بہرحال ان کا تعلق نیشنلسٹ علماء سے تھا۔ اس لئے ان کے پیشِ نظر اسلام کا وہی تصور تھا جو تحریکِ پاکستان کے مدِمقابل علماء کا مسلک تھا ـــــ آپ نے دیکھا ہوگا کہ الیکشن کے معرکے کے دوران انہوں نے اسلامی شریعت، شریعت کے احکام، شریعت کی تعزیرات وغیرہ کا

تام تو بکثرت لیا، لیکن دین کے نظام کی تفصیل پیش کرنا تو ایک طرف اس کا کہیں ذکر تک نہیں کیا۔ اس کے برعکس انہوں نے کہا یہ کہ:-

اگر پاکستان قومی اتحاد برسرِ اقتدار آیا، تو تمام مسلّمہ فرقوں کو اس امر کی آزادی ہوگی کہ وہ اپنی فقہ پر عمل کریں اور مذہبی رسومات اس طرح ادا کریں جس طرح وہ کر رہے ہیں۔

ایک بیان میں انہوں نے پیپلز پارٹی پر الزام لگایا کہ وہ خفیہ طور پر یہ افواہیں پھیلا رہی ہے کہ:-

جب قومی اتحاد برسرِ اقتدار آئے گا تو شیعہ فرقے پر پابندی لگا دے گا کہ وہ حضرت امام حسینؓ کی عزہ داری نہ کرے۔ یہ شرانگیز خبر سراپا غلط اور بے بنیاد ہے۔ قومی اتحاد کی طرف سے یہ واضح کیا جاتا ہے کہ عزہ داری پر کوئی پابندی نہ ہوگی۔ شیعہ حضرات اسی طرح اپنے مذہبی دن منائیں گے جس طرح وہ مناتے ہیں۔ پاکستان میں تمام مسلمانوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ کوئی کسی فرقے کو اس کے حق سے محروم نہیں کر سکتا۔ قومی اتحاد کی طرف سے یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ ہر فرقے کو مذہبی امور میں مکمل آزادی حاصل ہوگی۔ (نوائے وقت لاہور۔ مورخہ ۲۱ر فروری ۱۹۷۷ء)

آپ نے دیکھا کہ یہ یکسر وہی موقف ہے جو غیر منقسم ہندوستان میں کانگریس کی طرف سے پیش کیا جاتا تھا اور جس کی بنا پر نیشنلسٹ علماء کہتے تھے کہ اس ضمانت کے بعد مسلمانوں کو اپنی جداگانہ مملکت متشکل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اس سے اسلام کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ ان میں سے کسی صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ پبلک لاء کے متعلق کیا ہوگا؟ مملکت کے پبلک لاء تو ہر فرقے کے الگ الگ نہیں ہو سکتے۔ ان کا تو ایک ہی ضابطہ ہوگا جو تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر لاگو ہوگا۔ وہ ضابطہ کس طرح مرتب کیا جائے گا؟ اس کے متعلق ایک لفظ تک نہیں کہا گیا۔ قومی اتحاد میں جماعتِ اسلامی بھی شامل تھی۔ پبلک لاء کے متعلق اس جماعت کے بانی مودودی صاحب پہلے ہی اعلان کر چکے ہیں کہ ان کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب کرنا ممکن نہیں جسے تمام فرقے متفق طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔

یہ وجہ ہے جو اسلامی نظامِ شریعت کا نعرہ بلند کرتے وقت ان میں سے کسی نے پبلک لاء کے ضابطہ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک اسلامی نظام سے مقصد صرف اتنا ہے کہ اس میں ہر فرقے کو اپنی اپنی فقہ پر عمل کرنے کی آزادی ہوگی ——— اور بس! اس میں وہ دو چار شرعی سزاؤں کا اضافہ بھی کرتے ہیں۔ لیکن یہ بھی مغالطہ آفرینی پر مبنی ہے۔ جب ان سزاؤں سے متعلق تفصیلی قوانین مرتب کرنے کا وقت آئے گا تو مختلف فرقوں کے اختلافات ابھر کر سامنے آ جائیں گے۔ یہ ہے اُس اسلام کی حقیقت جسے انتخابی معرکہ آرائیوں میں اس شد و مد سے اچھالا گیا۔

ضمناً، ہم مفتی محمود صاحب اور اُن کے ہم نواؤں سے باادب ایک سوال پوچھنے کی جرأت کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اُن کے برسرِ اقتدار اسلامی مملکت میں تمام فرقوں کو اپنے اپنے معتقدات پر قائم رہنے اور اپنی اپنی فقہ پر عمل کرنے کی کامل آزادی ہوگی۔ حضورؐ نبی اکرم کی ایک حدیث بیان کی جاتی ہے جسے یہ حضرات بکثرت پیش کیا کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ:-

بنی اسرائیل کی قوم بہتّر (۷۲) فرقوں میں منقسم ہوگی۔ جس میں سے صرف ایک فرقہ جنتی ہوگا۔ باقی سب دوزخ میں جائیں گے۔

(مشکوٰۃ۔ بحوالہ ترمذی۔ باب، اعتصام بکتاب و سنت)

ہم محترم مفتی صاحب سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ جس اسلامی مملکت کے آپ سربراہ ہوں گے (یا جس کی زمامِ اقتدار آپ کے گروہ کے ہاتھ میں ہوگی) کیا اُس میں آپ اُن بہتّر (۷۲) فرقوں کو اسلامی تسلیم کریں گے جنہیں نبی اکرمؐ نے دوزخی قرار دیا ہے؟ کیا آپ ان دوزخی فرقوں کو اس امر کی آزادی دیں گے کہ وہ اپنے اپنے معتقدات اور مسالک کو اسلامی قرار دیتے ہوئے ان کی پوری پوری پابندی کرتے رہیں؟ یہی سوال ہم اُن دیگر علمائے کرام سے بھی پوچھنا چاہتے ہیں جو قومی اتحاد میں شامل اور مفتی صاحب محترم کے ہم نوا تھے ـــــ ہمیں یقین ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اس حدیث کو صحیح تسلیم کرنے سے انکار نہیں کرے گا، کیونکہ اس کی بنا پر وہ اپنے فرقے کو چھوڑ کر باقی تمام فرقوں کے خلاف کفر کے فتوے عائد کرتے رہتے ہیں۔ شیعہ اور سُنّی اختلافات سے قطع نظر، ہم صرف سُنّی حضرات سے متعلق بات کرتے ہیں ـــ مفتی صاحب دیوبندی مسلک سے متعلق ہیں۔ محترم شاہ احمد نورانی صاحب بریلوی فرقہ سے۔ اِن میں بعض حضرات اہلِ حدیث مسلک کے پیرو ہیں۔ کیا ان میں سے ہر فرقہ نے دوسروں کے خلاف کفر کے فتوے صادر نہیں کر رکھے؟ اور پھر اِن سب کی طرف سے مودودی صاحب کے خلاف جو کچھ کہا جاتا رہا ہے، اور جو کچھ مودودی صاحب ان کے متعلق کہتے چلے آ رہے ہیں وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اِن حقائق کی روشنی میں ہم ان سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا آپ اِن تمام فرقوں اور جماعتِ اسلامی کو برسرِ حق سمجھتے ہیں؟

اِن حقائق سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ جس اسلام کے نفاذ کے لئے یہ حضرات عوام سے اپنے حق میں ووٹوں کے طلب گار تھے، اُس اسلام کی خود اِن کے اپنے مسلک کی رُو سے حقیقت کیا ہے! ہماری آنکھوں نے اِن سے پہلے بھی بعض علماء کو دیکھا ہے۔ ان سے ہزار اختلاف کے باوجود ہم اِس حقیقت کے اظہار میں کوئی تامل محسوس نہیں کرتے کہ ان کی دیانت اور تقویٰ کی یہ کیفیت تھی کہ وہ کسی مصلحت کی خاطر، باطل سے چشم پوشی کرنے یا اُسے برحق قرار دینے کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ وہ جس عقیدہ یا مسلک کو غلط اور باطل سمجھتے تھے اُسے ہر مقام اور ہر موقع پر غلط اور باطل کہتے تھے، اور اس سے کسی قسم کی مفاہمت کے لئے

کبھی تیار نہیں ہوتے تھے۔ لیکن، بُرا ہو اس میکیاولی سیاست کا جس نے ان علماء کے جانشینوں کو اس مقام پہ پہنچا دیا ہے کہ یہ ہر اس فرقہ یا جماعت اور گروہ سے مفاہمت ہی نہیں، بلکہ موافقت کے لئے تیار ہو جاتے ہیں جس کے خلاف انہوں نے خود کفر کے فتوے صادر کر رکھے ہوتے ہیں، بشرطیکہ وہ حصولِ مفاد کے لئے ان کا ہم نوا ہو جائے۔ یہ وہ مسلک ہے جسے مودودی صاحب نے "حکمتِ عملی" کا نام دے کر عین تقاضائے اسلام قرار دے لکھا ہے۔ جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے، نہ ہمارا تعلق کسی پارٹی یا فرقے سے ہے، اور نہ ہی ہم عملی سیاست میں حصہ لیتے ہیں۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں مفاد پرستی کی خاطر اسلام کو کس طرح بدنام کیا جاتا ہے تو ہمارا دل خون ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایسا ہی وہ مقام تھا جہاں علامہ اقبالؒ نے اپنے بسترِ مرگ سے مدیر "احسان" کے نام اپنے خط میں لکھا تھا کہ:-

وہ شخص جو دین کو سیاسی پراپیگنڈے کا پردہ بناتا ہے، میرے نزدیک لعنتی ہے۔

(انوارِ اقبالؒ۔ ص۱۶۸۔ از بشیر احمد ڈار)

جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا ہے، سرِدست ہم اپنی نگارشات کو اسی ایک نکتہ تک محدود رکھتے ہیں۔ ان معرکوں میں اسلام کے نام پر۔ اور کیا کچھ ہوا ——— بالخصوص جماعتِ اسلامی کی طرف سے ——— اسے ہم کسی آئندہ فرصت پہ اٹھا رکھتے ہیں۔ آخر میں ہم ملک کی تمام پارٹیوں اور جماعتوں سے گذارش کریں گے کہ آپ سیاسی لڑائیوں کو سیاسی انداز سے لڑا کریں۔ خدا کے لئے اسلام کو درمیان میں نہ لایا کریں۔ اس سے آپ کو شاید کچھ وقتی مفاد حاصل ہو جاتے ہیں، لیکن اسلام کو اس سے جو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا ہے اس کے نتائج بڑے دُور رس ہوتے ہیں۔ یہ مملکت حاصل اس لئے کی گئی تھی کہ اس میں صحیح اسلامی (قرآنی) نظام رائج ہوگا تو دنیا لپک کر اسلام کی طرف آئے گی۔ لیکن ہم جس طرح اسلام کو اپنی پست سیاسی اغراض کے حصول کیلئے سپر بناتے ہیں، اس سے دنیا اس سے اور دُور ہٹتی چلی جاتی ہے۔

وذالک ھو الخسران المبین۔

مارچ کے مہینے میں ایک دن (۲۳ مارچ) وہ آتا ہے جو ملتِ اسلامیہ کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے عام طور پر "یومِ پاکستان" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ چند صفحات آگے جا کر آپ پرویز صاحب کا خطاب ملاحظہ فرمائیں گے جسے انہوں نے اس تقریب کے سلسلہ میں خاص طور پر قلم بند کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ایک مقالہ جس میں اس چومکھی لڑائی کی تفصیل دی گئی ہے، جسے قائدِ اعظمؒ کو حصولِ پاکستان کے سلسلہ میں لڑنا پڑا تھا۔

آئندہ ماہ (اپریل) میں یومِ اقبالؒ کی تقریب پر بھی ایک جامع خطاب پرویز کے زیرِ تسوید ہے جس میں وہ بتائیں گے کہ حضرت علامہؒ کے نزدیک اسلامی مملکت کا کیا تصور تھا۔ اس خطاب کی اہمیت واضح ہے۔

تفسیر مطالب الفرقان کی دوسری جلد بھی

شائع ہوگئی

اِس جلد کے نمایاں عنوانات کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے :-

۱- انسان کی پیدائش ـــــ نظریۂ ارتقاء -
۲- نفسِ انسانی کیا ہے ؟
۳- کیا انسان کی کوئی فطرت ہے ؟
۴- جن وانس کا مفہوم کیا ہے ؟
۵- ابلیس کون ہے ؟
۶- قصۂ آدم ـــــ کیا انسان خدا کا خلیفہ ہے ؟
۷- ملائکہ کی کنہ وحقیقت -
۸- جنتِ آدم -
۹- عورت کا مقام -
۱۰- داستانِ بنی اسرائیل ـــــ (قوموں کا عروج وزوال)
۱۱- شفاعت کا عقیدہ -
۱۲- سمندر کیسے پھٹا تھا ؟
۱۳- یہودیوں کے بندر بن جانے کا مفہوم -
۱۴- ذبحِ گائے ـــــ مُردہ کا زندہ ہونا -
۱۵- غلام اور لونڈیاں
۱۶- ہمارے علماء کی حالت -
۱۷- آنے والے کا عقیدہ ـــــ (مجدّد - مہدی - نزولِ مسیحؑ)
۱۸- ہاروت وماروت کا افسانہ -
۱۹- جادو کی حقیقت ـــ تصوف اور اسلام -
۲۰- ناسخ ومنسوخ کا عقیدہ -

یہ: اور اِسی قسم کے دیگر سینکڑوں موضوعات پر سیر حاصل بحث -

ـــــ عمدہ سفید کاغذ ـــــ اوفسٹ کی طباعت ـــــ خوبصورت ، مضبوط ، طلائی جلد ـــــ
ـــــ ضخامت پونے پانچ سو صفحات ـــــ قیمت پچاس روپے - (علاوہ محصول ڈاک)

(مطالب الفرقان ، جلد اوّل ، قیمت چالیس روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ

۱- ادارۂ طلوعِ اسلام ، گلبرگ ۲ لاہور - ۲- مکتبہ دین ودانش چوک اردو بازار لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

قائدِ اعظمؒ — اور — قرآنِ مجید

(مملکتِ پاکستان کی اصل اور بنیاد)

یومِ پاکستان (مارچ ۱۹۷۷ء) پر

پرویز صاحب کا خطاب

ادارۂ طلوعِ اسلام ۔ گلبرگ ۲ لاہور

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قائدِ اعظمؒ — اور — قرآنِ مجید

اے دوست! سنائے جا بھولے ہوئے افسانے

اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرمؐ سے فرمایا کہ: وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللّٰهِ (۱۴/۵) "تم انہیں اللہ کے دنوں کی یاد دلایا کرو"۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ جملہ کائنات اور اس کے شب و روز سب خدا ہی کے ہیں۔ پھر وہ کونسے دن ہیں جنہیں خدا نے خود اپنے دن کہہ کر پکارا ہے۔ یہ دن وہ ہیں جن میں کوئی ایسا انقلاب آفریں واقعہ ظہور پذیر ہوا ہو جو منشائے خداوندی کے مطابق ہو اور خدا کے پروگرام کی تکمیل کی کڑی قرار پائے۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے اُسی مقام پر واضح کر دیا ہے جہاں ایامِ اللہ کی یاد دلانے کا حکم دیا گیا ہے۔ وہاں کہا یہ گیا ہے کہ ہم نے (حضرت) موسےٰؑ کو اپنے قوانین دے کر بھیجا اور اس سے کہا کہ جاؤ۔ اور اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۱۴/۵) اپنی قوم کو فرعون کی غلامی سے نجات دلا کر آزادی کی فضائے بسیط کی طرف لے آؤ جہاں وہ منشائے خداوندی کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ یعنی تم اپنی قوم کو ظلم و استبداد کی تاریکیوں سے نکال کر عدل و حریت کی روشنی کی طرف لے آؤ۔

ایامِ اللہ اس سے واضح ہے کہ جس دن کوئی قوم انسانوں کی محکومیت اور غلامی سے رستگاری حاصل کر کے اطاعتِ خداوندی کو اپنا شعارِ زندگی قرار دے لے، اس دن کا شمار ایام اللہ میں ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ۲۳ مارچ (۱۹۴۰ء) کا دن ہماری تاریخ میں ایامِ اللہ کے زمرے میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ کہا جائے گا کہ دنیا میں سینکڑوں قومیں، دوسروں کی غلامی سے نجات حاصل کر کے اپنی آزادی کا عزم کرتیں، اور اسے حاصل بھی کر لیتی ہیں۔ صدرِ اوّل کے بعد، اس ہزار برس کے زمانے میں خود مسلمانوں کی تاریخ میں ایسے واقعات موجود ہیں جن میں انہوں نے دشمنوں کو شکست دے کر اپنی آزادی کو حاصل کیا یا برقرار رکھا۔ اگر انہیں ایامِ اللہ قرار نہیں دیا جا سکتا تو پھر ۲۳ مارچ (۱۹۴۰ء) میں کونسی ایسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر اس کا شمار ایامِ اللہ میں کیا جانا چاہیئے۔ ۲۳ مارچ (۱۹۴۰ء) کو فی الواقعہ ایسی خصوصیت حاصل ہے ——— وہ خصوصیت یہ ہے کہ اس دن مسلمانانِ ہند

نے، انگریز یا ہندو کی غلامی سے رستگاری حاصل کرنے کا عزم ہی نہیں کیا تھا۔ اس دن انہوں نے، بہانگِ دھل، اس حقیقتِ کبریٰ کا اعلان کیا تھا کہ :-

(۱) مسلمان، ایمان کے اشتراک کی بنا پر، ایک مختلف قوم ہیں اور وہ کسی غیر مسلم قوم کا جزو نہیں بن سکتے ۔ اور

(۲) ہم ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کرنا چاہتے ہیں جس میں ہم دینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

یہ ہے ۲۳ مارچ (سنہ ۱۹۴۰ء) کی وہ امتیازی خصوصیت جس کی بنا پر اس کا شمار ایام اللہ میں ہوتا ہے اور جس کی وجہ سے وہ دیگر اقوام کی تحریکاتِ آزادی سے یکسر منفرد ہے۔

لیکن وائے برحالِ ما کہ ہم نے ۲۳ مارچ کی یاد کو تو برقرار رکھا لیکن اس کی وجۂ تخصیص کو یکسر فراموش کر دیا۔ پہلے تو ہم اس کی یاد، صرف ایک دن منایا کرتے تھے لیکن سالِ گذشتہ (سنہ ۱۹۷۶ء) ہم اس کی یاد سال بھر مناتے رہے۔ جسے "قائدِ اعظمؒ کے جشنِ میلاد کا سال" نام دیا گیا تھا، وہ درحقیقت ۲۳ مارچ ہی کی ایک پھیلی ہوئی شکل تھی۔ اس لئے کہ اگر تاریخ کے اس دور سے اس عظیم انقلابی واقعہ کو خارج کر دیا جائے گا، تو پھر نہ تحریکِ پاکستان کا کوئی قابلِ ذکر وجود باقی رہتا ہے، نہ قائدِ اعظمؒ کی زندگی کا کوئی حیات آور تصور۔ اس طویل المسافت جشن کے سلسلہ میں سیکڑوں مذاکرات، سیمینار، مباحثات منعقد ہوئے، ہزاروں تقاریر ہوئیں۔ کثیر التعداد مقالات لکھے گئے۔ بکثرت کتابیں تصنیف ہوئیں، اس کے منقطع کے بند کے طور پر بین الاقوامی سطح پر ایک عدیم النظیر کانفرنس منعقد ہوئی جس میں پاکستان اور بیرونی ممالک کے قریب دو صد مندوبین نے شرکت کی۔ ان میں (۴۴) بیرونی ممالک کے (۹۰) سکالر بھی شریک تھے۔ کانفرنس پانچ دن تک جاری رہی جس میں ساٹھ سے زیادہ بلندپایہ علمی اور تحقیقاتی مقالات پڑھے گئے[1]۔ ان تقاریر، مقالات اور تصانیف میں، قائدِ اعظمؒ اور تحریکِ پاکستان کے متعلق اور تو سب کچھ کہا گیا لیکن اس بنیادی خصوصیت کا ذکر کہیں سامنے نہیں آیا جس کی بنا پر، یہ تحریک، دیگر اقوام کی تحریکاتِ آزادی سے منفرد تھی۔ یعنی سال بھر میں کسی نے یہ نہیں کہا کہ اس تحریک کی بنیاد قرآنِ مجید پر تھی اور قائدِ اعظمؒ کے پیشِ نظر ایک ایسی مملکت کا حصول اور قیام تھا جو کتاب اللہ کے حقائقِ ابدی پر استوار ہو اور جس کا جملہ کاروبار، خدا کی مقرر کردہ حدود و اصول کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس تحریک کو ہم آج دنیا کے سامنے اس شکل میں پیش کر رہے ہیں جس میں اس خصوصیت کا کوئی ذکر نہیں تو کل کو آنے والا مؤرخ اس کی اصل و حقیقت کو کیا سمجھے گا؟

مجھے، عزیزانِ من! اس کا فخر اور سعادت حاصل ہے کہ میں نے قریب دس سال تک، تا بحدِ امکان و

---

[1] بحوالہ طلوعِ اسلام بابت فروری سنہ ۱۹۷۷ء۔

استطاعت، قائداعظمؒ کے زیرِ لوا، اس تحریک میں حصہ لیا، اور ۲۳ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کے جس عظیم اجلاس میں ملّتِ اسلامیہ نے اپنے اس عزم کا اظہار و اعلان کیا، میں اس میں نہ صرف انفرادی طور پر شریک تھا بلکہ، پنڈال سے متصل، طلوعِ اسلام کا کیمپ، ان مذاکرات کا محور تھا۔ میں اس سے پہلے بھی اس حقیقت کی وضاحت کر چکا ہوں[1] کہ قائداعظمؒ (مرحوم و مغفور) کے ساتھ میرے تعلقات کی بنیاد بھی، قرآنِ مجید، کے ساتھ ان کی والہانہ شیفتگی اور دلفروشانہ وابستگی تھی۔ لہٰذا، میں اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر اس حقیقتِ کبریٰ کا بلاخوفِ تردید اعلان کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ مطالبۂ پاکستان سے ان کے پیشِ نظر ایک ایسی مملکت کا قیام تھا جس کا جملہ نظم و نسق قرآنی اصول و اقدار کے مطابق سرانجام پائے۔ بنابریں، میں اسے اپنا فریضہ سمجھتا ہوں کہ قوم کو اس فراموش کردہ حقیقت کی یاد دلاتا رہوں کہ اس مملکت کو کس مقصد کے لئے حاصل کیا گیا تھا اور قائداعظمؒ کے پیشِ نظر اس کا کیا تصوّر تھا۔ میں، اپنی استطاعت کے مطابق، تشکیلِ پاکستان کے یومِ تاسیس سے لے کر آج تک ہر موقعہ پر اس حقیقت کو دہرائے چلا آ رہا ہوں، اور جب تک توفیقِ ایزدی میرے شاملِ حال ہے، میں اپنے اس فریضہ کو سرانجام دیتا رہوں گا۔ یہی تحریکِ طلوعِ اسلام کا بھی مقصود و مطلوب ہے ؎

شاید کوئی غنچہ چٹکے، شاید کوئی پھول سے کھلے　　اس اک آس پہ گلشن گلشن ہم نے نغمے گائے ہیں

قائداعظمؒ نے اپنی سیاسی زندگی کا معتدبہ حصّہ، نیشنلسٹ کی حیثیت سے گزارا، اور اس دور کے ہندو اور مسلمان نیشنلسٹوں میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ نیشنلسٹ مسلمان کے معنی یہ تھے کہ وہ اسلام کو ایک مذہب سمجھتے تھے جس پر ہر حکومت کے اندر عمل پیرا ہوا جا سکتا ہے۔ قومیت کا معیار وطن کا اشتراک ہے، اور طرزِ حکومت مغرب کا جمہوری انداز۔ اسی کو سیکولرازم کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مسٹر جناحؒ ان نظریات کے حامی اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے مسلسل مصروفِ تگ و تاز رہے۔ لیکن کچھ عرصہ کے عملی تجربہ کے بعد، ان پر اس نہج سیاست کی ناکامی کا راز عیاں ہو گیا' اور چونکہ دوسرا کوئی نظریہ ان کے سامنے تھا نہیں اس لئے وہ سیاست سے دست کش ہو کر، انگلستان جا بسے۔ علامہ اقبالؒ کی دیدہ وری نے اس گوہرِ یکتا کو پہچانا' اور اسلام کا نظریۂ سیاست و حکومت ان پر وانشگاف کیا۔ لیکن جناحؒ جیسے کوہِ گراں کے نظریہ میں اس قسم کا انقلابی تغیّر پیدا کرنا، نہ تو بچوں کا کھیل تھا، اور نہ ہی ایک دن کا مسئلہ۔ چنانچہ ہیکٹر بولیتھو کے بیان کے مطابق' قریب دس[2] سال کی بحث و تمحیص

مسٹر جناح کے نظریہ میں انقلاب

اور غور و فکر کے بعد، مسٹر جناحؒ اقبالؒ کے نظریہ سے متفق ہو کر ہندوستان لوٹ آئے۔ مسٹر جناح کی وطن کی طرف یہ مراجعت، ایک عظیم انقلاب کی تمہید تھی، جس کی کسی کو بھی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ کسی سیاسی جھکڑ کے زور پر مرغِ بادنما کی تبدیلیٔ سمت نہیں تھی ——— یہ قلب و دماغ کی تبدیلی تھی اور سالہا

---

[1] ملاحظہ ہو میرا مقالہ "عظمتِ کردار کا گوہرِ تابدار" ——— قائداعظمؒ

[2] اتنا زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

سال کے غور و تدبر کا نتیجہ۔ چنانچہ جب ۱۹۳۷ء میں مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا پہلی بار اتفاق ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ اسلام کے نظامِ حیات اور دین کے ضابطۂ زندگی ہونے کے تصور سے اچھی طرح روشناس تھے اور ان کی صداقت کے بہ صمیم قلب معترف۔ اس کے بعد قریب دس سال تک ان کے ساتھ میرا رابطہ رہا اور ہر ملاقات میں موضوعِ سخن بیشتر قرآنی اصول و اقدار کی عملی تفاصیل۔ ان جیسا ذکی الفہم انسان میری نظروں سے کم ہی گذرا ہوگا۔ وہ علامہ اقبالؒ کے اس معیارِ دیدہ وری کی جیتی جاگتی تصویر تھے ـــــ کہ خارے دیدہ احوالِ چمن گفت ـــــ انہوں نے مسلمانانِ ہند کی سیاست کی بنیاد اسلام پر رکھی اور اس دس سالہ کش مکش میں، جس تکرار و اصرار سے قرآن کے پیغام کو پیش کیا، اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ میں اس مختصر سی صحبت میں اس نکتہ کی وضاحت کی کوشش کروں گا کہ انہوں نے کس طرح سیاست کی بنیاد اسلام پر استوار کی اور پھر کس طرح اسے قرآنی حقائق و شواہد سے محکم سے محکم تر کرتے چلے گئے۔ وہ قرآن جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

فاش گویم، آنچہ در دل مضمر است ۔۔۔ ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود ۔۔۔ جاں چوں دیگر شد، جہاں دیگر شود!

قائداعظمؒ اس راز کو پا گئے تھے۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، مسلمانانِ ہند نے اپنے اس عزم اور انقلابِ عظیم کا اعلان ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو، زیارت گاہِ اہلِ بصیرت، علامہ اقبالؒ کے مرقد کے سرہانے اپنے اس مشہور ریزولیشن کی شکل میں کیا جسے قراردادِ پاکستان کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس اجتماع کے بحرِ بے کنار سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے فرمایا:

> میرے لئے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی، اسلام اور ہندومت کی، حقیقت اور اصلیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کرتے ہیں ـــــ یہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں "مذہب" نہیں ہیں، بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں اور اس بنا پر متحدہ قومیت ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھئے! ہندو اور مسلمان زندگی کے ہر معاملہ میں جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ یہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر قائم ہیں۔ دو ایسی قوموں کا ایک نظامِ حکومت میں جکڑ دینا، باہمی مناقشت کو بڑھائے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر دے گا جو اس ملک کے لئے وضع کیا گیا ہو۔
>
> (تقاریر جناحؒ۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۱۷۸ - ۱۷۷)

آپ نے دیکھا کہ قائداعظمؒ نے کیسے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا کہ ہمارے مطالبہ کی بنیاد ہمارے دین کا تقاضا

ہے، نہ کہ ہنگامی سیاست۔ اس سے بھی پہلے، مسٹر گاندھی نے آپ پر یہ اعتراض کیا تھا کہ آپ مذہب کو خواہ مخواہ سیاست میں گھسیٹ رہے ہیں۔ قائداعظمؒ نے اپنے خط مرقومہ یکم جنوری ۱۹۴۰ء کو، اس کا، جواب ان الفاظ میں دیا تھا:۔

آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے لیکن جب خود آپ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ کونسی قوت محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ کیا وہ مذہب ہے یا سیاست؟ یا عمرانی اصلاح۔ تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے۔ (لہٰذا مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے ہو نہیں سکتے۔) آپ تمدنی، معاشی، سیاسی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے۔ جس مذہب، کو نوعِ انسان سے واسطہ نہیں، میں اُسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں، اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ انسانی زندگی نہیں، محض غوغہ آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے۔ جس میں، شور و شغب تو بہت ہوتا ہے، لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔ (تقاریر جناحؒ۔ جلد اول۔ صفحہ ۱۴۰-۱۳۹)

آپ اس خط کے ایک ایک لفظ پر غور فرمائیے اور پھر سامنے لائیے علامہ اقبالؒ کی اس بصیرت افروز نظم کو جو "دین و سیاست" کے عنوان سے، بالِ جبریل، میں درج ہے اور جس میں انہوں نے کہا ہے ؎

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی، سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیری!
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی دوئی چشمِ تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیںؐ کا بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدیؒ و اردشیری

آپ اس نظم کو دیکھیں اور پھر سوچیں کہ صحبتِ حکیم الامتؒ نے مسٹر جناحؒ کے قلب و نگاہ میں کس قدر گہرا قرآنی انقلاب پیدا کر دیا تھا، اور وہ غیر ذمہ دار، منہ پھٹ جو آج اقبالؒ کو کمیونزم کا حامی اور قائداعظمؒ کو سوشلسٹ اور سیکولر اسٹیٹ کا داعی قرار دیتے ہوئے ذرا نہیں شرماتے، غور کریں کہ ان کی سیاست: کس طرح دین کی بنیادوں پر استوار تھی۔ اور ان کے ساتھ ہی دین اور سیاست میں علیحدگی یا زندگی کو الگ الگ مذہبی، سیاسی، معاشی، دوائر میں تقسیم کرنے کے داعی بھی سوچیں کہ کیا وہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے نظریات کا اتباع کرتے ہیں یا مغرب کے سیکولر نظریۂ سیاست کا! قائداعظمؒ نے ۱۳ نومبر ۱۹۳۹ء

اسلام بنیادِ وحدت

کہ ریڈیو پر پیغامِ عید نشر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:-

معاشی احیاء ہو یا سیاسی آزادی۔ اسے آخرالامر زندگی کے کسی گہرے مفہوم پر مبنی ہونا چاہیئے۔ اور مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ ہمارے نزدیک زندگی کا وہ گہرا مفہوم اسلام اور روحِ اسلام ہے۔ (تقاریر۔ جلد اوّل۔ ص ۱۱)

انہوں نے مارچ ۱۹۴۴ء میں، پنجاب سٹوڈنٹس فیڈریشن کانفرنس کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ذاتوں اور برادریوں کی تقسیم اور شیعہ سنی کی تفریق ہمیں ایک قوم نہیں بننے دے گی۔ ان تفریقات کو ختم کر دیجئے۔ یاد رکھیئے۔

ہماری کشتی کا لنگر اور ہماری عمارت کی بنیاد صرف اسلام ہے۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ ص ۸۹)

انہوں نے ۲۱ر نومبر ۱۹۴۵ء کو فرنٹیئر مسلم لیگ کانفرنس، پشاور سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:-

سوال یہ ہے کہ جس آزادی کے لئے ہم جدوجہد کر رہے ہیں اس کے حصول کے لئے ہمارے پاس قوت کونسی ہے؟ ہماری وہ قوت، ہمارا مذہب۔ ہماری ثقافت اور اسلامک آئیڈیلز (نظریات) ہیں۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ ص ۳۴۵)

انہوں نے ۱۹۴۵ء میں اپنے پیغامِ عید میں قوم سے کہا:-

یاد رکھیئے۔ اسلام صرف روحانی احکام اور نظریات یا مذہبی رسوم و مراسم کا نام نہیں۔ یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو اسلامی معاشرہ کے ہر گوشے کو محیط ہے ــــ خواہ اس کا تعلق انفرادی زندگی سے ہو اور خواہ حیاتِ اجتماعیہ سے (تقاریر۔ جلد دوم۔ ص ۳۰۱)

کہاں ہیں وہ لوگ جو اسلام کا نام لینے کے باوجود، سیاست کے لئے مغربی جمہوریت اور معیشت کے لئے روس یا چین کی طرف آنکھیں لگائے رکھتے ہیں۔ وہ اگر قرآن کی زبان سے براہِ راست نہیں سننا چاہتے تو کم از کم قائداعظمؒ کی وساطت سے یہ پیغامِ خداوندی سن لیں کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو اسلامی معاشرہ کے ہر گوشے کو محیط ہے۔ قائداعظمؒ کا اس پر ایمان تھا کہ اسلام دین ہے اور دین سے مقصود ہے۔ انسانی زندگی کے ہر گوشے۔ سیاسی۔ معاشی۔ معاشرتی ــــ وغیرہ کے لئے مکمل نظام اور ضابطہ۔

اسی بنا پر انہوں نے ۲۱۔ نومبر ۱۹۴۵ء کو فرنٹیئر مسلم کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:-

مسلمان اس لئے پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں کہ اس مملکت میں وہ اپنے ضابطہ زندگی۔ اپنے ثقافتی نشو و نما اور روایات۔ اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

(تقاریر۔ جلد دوم۔ ص ۳۴۳)

اسی طرح انہوں نے ۲۷ر نومبر ۱۹۴۵ء کو ایڈورڈز کالج، پشاور، کے طلبا کے سپاسنامہ کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:-

ہم، ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ہمارا مذہب ایک دوسرے سے مختلف ہے، بلکہ ہمارا کلچر بھی الگ ہے۔ ہمارا مذہب ہمیں ایک ایسا ضابطۂ حیات عطا کرتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے

کو محیط ہے۔ ہم اسی ضابطہ کے آئیڈیلز کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

(تقاریر۔ حصہ دوم۔ ص ۳۴۶)

آپ نے غور فرمایا کہ قائدِاعظمؒ ہر تقریب اور ہر موقعہ پر، کس طرح اسلام، اسلامی نظام۔ اسلامی ضابطۂ حیات کے الفاظ دہرائے چلے جاتے تھے تاکہ کسی کو اس باب میں کسی قسم کی غلط فہمی یا ابہام نہ رہے کہ مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ کیا ہے اور اس مملکت کی تشکیل سے مطلوب و مقصود کیا۔ ہمارے دور میں یہ تصورات علامہ اقبالؒ کی قرآنی بصیرت کے رہینِ منت تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی، حکیم الامتؒ اس حقیقت سے بھی بخوبی واقف تھے کہ اس ہزار سال میں لفظ اسلام کو کیا کیا معنی پہنائے گئے ہیں، اور آج کس طرح ہر فرقہ اس کا الگ الگ مفہوم پیش کرتا، اور اپنے، اور صرف اپنے مفہوم کو، حقیقی اسلام قرار دیتا ہے۔ اس تشتّتِ فکر و خیال اور اختلافِ نظریات و مسالک کے پیشِ نظر انہوں نے ضروری سمجھا کہ

قرآن مجید

اس حقیقت کو واضح اور متعین طور پر بیان کر دیا جائے کہ اسلام کی اصل و اساس خدا کی کتابِ عظیم، قرآن مجید ہے اور اسلامی مملکت کی جملہ تفاصیل اسی بنیاد پر متفرع ہوں گی۔ سردست نہ تو اتنا وقت ہے اور نہ ہی میرے پیشِ نظر یہ موضوع۔ میرا ارادہ ہے کہ آئندہ اپریل یوم اقبالؒ کی تقریب پر میں، تفصیل سے عرض کروں کہ علامہ اقبالؒ نے قرآن کا کیا مقام بتایا ہے، اور اُسے کس طرح اسلامی مملکت کے لئے مکمل ضابطۂ حیات قرار دیا ہے۔ اس وقت میں صرف ان کے ایک شعر پر اکتفا کروں گا جس میں ساری بحث سمٹ کر آ جاتی ہے کہ ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بقرآں زیستن

علامہ اقبالؒ کے ساتھ اس قدر طویل تمسّک سے قائدِاعظمؒ بھی اس حقیقت کو اچھی طرح جان اور پہچان گئے تھے کہ دین کی اصل و اساس قرآنِ مجید ہے اور یہی وہ ضابطۂ حیات ہے جس کے مطابق نظام قائم کرنے سے ایک مملکت اسلامی کہلا سکتی ہے۔ دیکھئے، وہ مختلف مواقع پر اس بنیادی حقیقت کی وضاحت کس کس انداز سے کرتے تھے۔

اپریل ۱۹۴۳ء کا ذکر ہے کہ صوبہ سرحد کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے قائدِاعظمؒ سے ایک پیغام کے لئے درخواست کی۔ آپ نے جواب میں فرمایا:-

تم نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہیں کوئی پیغام دوں۔ میں تمہیں کیا پیغام دوں جبکہ ہمارے پاس پہلے ہی ایک عظیم پیغام موجود ہے جو ہماری راہ نمائی اور بصیرت افروزی کے لئے کافی ہے ــــ وہ پیغام ہے خدا کی کتابِ عظیم ــــ قرآنِ کریم۔

(تقاریر۔ جلد اوّل۔ ص ۱۶)

یہ پیغام خود خدا نے، حضور نبی اکرمؐ کی لسانِ مبارک سے دیا تھا جب کہا تھا کہ: اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ۔ (۲۹/۵۱) کیا یہ چیز ان کے لئے کافی نہیں کہ ہم نے تیری طرف اس کتاب کو نازل کیا ہے جسے ان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے؟ اسی حقیقت کا حضرت فاروقِ اعظمؓ نے ان تین جامع الفاظ میں اعلان فرمایا تھا کہ: حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ۔ ہمارے

لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔ یہی انقلاب آفریں اعلان تھا جسے حضور نبی اکرمؐ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں اُمت کے جمِ غفیر کے سامنے ان الفاظ میں ارشاد فرمایا تھا کہ:۔

و انی قد ترکت فیکم مالن تضلوا بعدہٗ ان اعتصمتم بہٖ — کتاب اللّٰہ

(سیرت، شبلی نعمانی۔ جلد دوم۔ صلاٗ۔ بحوالہ صحاح)

میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم نے اسے مضبوطی سے تھامے رکھا، تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ چیز کیا ہے؛ کتاب اللہ۔

علامہ اقبالؒ نے بھی اس حقیقت کو بار بار دہرایا ہے، اور ان کا یہ مصرعہ تو وردِ زبان رکھنے کے قابل ہے کہ:۔ ع

مومناں را تیغ با قرآں بس است

قائداعظمؒ نے اس مقام پر تو صرف اتنا کہا کہ جب ہمارے پاس پہلے ہی سے ایک عظیم پیغام موجود ہے تو اس کے بعد کسی اور پیغام کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ مختلف تقاریب پر اس اجمال کی تفصیل پیش کرتے رہے کہ قرآن کریم کس طرح زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری رہنمائی کے لئے کافی ہے۔ مثلاً انہوں نے ۱۹۴۵ء میں ملت کے نام پیغامِ عید کے سلسلہ میں فرمایا:

اس حقیقت سے ہر مسلمان واقف ہے کہ قرآن کے احکام مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں مشہور مؤرخ گبنؔ نے ایک جگہ لکھا کہ "بحرِ اطلانٹک سے لے کر گنگا تک، ہر جگہ قرآن کو ضابطۂ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوعِ انسان کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں۔ اور یہ قوانین غیر متبدل منشائے خداوندی کے مظہر ہیں"۔

اس کے بعد قائداعظمؒ فرماتے ہیں:۔

اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا بنیادی ضابطۂ زندگی ہے جو معاشرت، مذہب، تجارت، عدالت، فوج، دیوانی، فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کے معمولات۔ روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا۔ اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا۔ عام اخلاقیات ہوں یا جرائم۔ دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مؤاخذہ کا —— ان سب کے لئے اس میں قوانین موجود ہیں اسی لئے نبی اکرمؐ نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان قرآن کریم کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے۔ (انہیں الگ مذہبی پیشواؤں کی ضرورت ہی نہیں۔)

(تقاریر۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۰۰)

جیسا کہ معلوم ہے، مطالبۂ پاکستان سے مقصود ایک ایسی مملکت کا قیام تھا جس میں اسلامی نظامِ شریعت نافذ ہو سکے۔ اس پر غیروں کی طرف سے سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا تھا، اور اپنوں کے دل میں اس قسم کے

شکوک ابھرتے تھے کہ مسلمانوں میں مختلف مذہبی فرقے ہیں اور ان کے باہمی تفرقہ کا یہ عالم ہے کہ ایک فرقہ کے متبعین، دوسرے فرقہ والوں کے ساتھ مل کر نماز تک نہیں پڑھ سکتے، تو ان حالات میں وہ ضابطۂ قوانین کس طرح مرتب کیا جا سکے گا جو ان کے اختلافات کو ختم کر سکے، انہیں اسلامی مملکت کے متفق علیہ واحد "ضابطۂ شریعت"....... کی طرف لے آئے۔ قائداعظمؒ کو اس مسئلہ کی اہمیت اور نزاکت کا بخوبی احساس تھا، اور اس پر، خود میرے ساتھ اکثر گفتگو رہا کرتی تھی۔ لیکن وہ فکرِ اقبالؒ کی روشنی میں، اس حقیقت تک پہنچ چکے تھے کہ اگر قرآن مجید کو ضابطۂ قوانین کی اصل و اساس قرار دے دیا جائے تو یہ اختلافات مٹ جائیں گے۔ ہمارے مذہبی فرقوں کے باہمی اختلافات کا انہیں کس قدر علم و احساس تھا، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے۔ ۱۹۳۸ء کا ذکر ہے کہ ایک تبلیغی وفد نے جس میں مقتدر علماء حضرات شامل تھے، قائداعظمؒ سے ملاقات کی۔ ان حضرات نے دورانِ گفتگو، قائداعظمؒ سے کہا کہ آپ مسلم لیگ کے جلسوں کے لئے اس قدر وسیع و عریض پنڈال کھڑے کرتے ہیں۔ لاکھوں کی تعداد میں لوگوں کو جمع کرتے ہیں۔ اس سے آپ کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ قائداعظمؒ نے کہا کہ، علاوہ دیگر امور، اس سے غیر مسلموں کے دل پر ملتِ اسلامیہ کے اتحاد اور ان کی ہیئتِ اجتماعیہ کا بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس کے لئے ہم آپ کو اس سے زیادہ مؤثر طریق بتاتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ آپ نماز کے وقت اسی پنڈال میں باجماعت نماز ادا کرنے کا اہتمام کیا کریں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ نماز کی اہمیت سے تو مجھے انکار نہیں لیکن آپ کی تجویز میں مجھے ایک خطرہ نظر آتا ہے۔ نماز باجماعت میں ایک امام کا ہونا ضروری ہے۔ اگر میں خود امامت

مَیں امام کِس کو بناؤں؟

کے لئے کھڑا ہو جاؤں تو شاید تمام حاضرین میرے پیچھے نماز پڑھ لینے میں مضائقہ نہ سمجھیں۔ لیکن میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا۔ اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوگا کہ امام کسے بنایا جائے۔ اگر امام دیوبندی ہوگا تو بریلوی حضرات اس کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کر دیں گے۔ اس صورتِ حال میں یہی ہوگا کہ ایک ہی پنڈال میں، مختلف جماعتیں کھڑی ہو جائیں گی۔ اس سے غیر مسلموں کے سامنے امتِ مسلمہ کے اختلافات نمایاں ہو جائیں گے اور وہ کہیں گے کہ جو قوم ایک امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھ سکتی، وہ ایک متفق علیہ اسلامی مملکت کیسے قائم کرے گی؟ اس لئے معاف فرمائیے۔ اس وقت تو میں آپ کی تجویز پر عمل کرنے سے معذور ہوں۔ آئندہ دیکھا جائے گا[1]۔

ضمناً آپ کو یاد ہوگا کہ حالیہ (۱۹۷۷ء کے) انتخابات کی مہم کے دوران، محترم کوثر نیازی صاحب نے یہ چیلنج دیا تھا کہ اگر "قومی اتحاد" والوں میں سے مفتی محمود۔ مولانا شاہ احمد نورانی اور مولانا مودودی صاحب جیکب لائنز کراچی کی جامع مسجد میں، اکٹھے نماز پڑھ لیں تو وہ پیپلز پارٹی کے امیدوار، کمال اظفر سے کہیں گے

---

[1] "تعمیرِ پاکستان اور علماءِ ربانی" از منشی عبدالرحمٰن صاحب۔ بحوالہ "اسلام اور قائداعظمؒ" از محمد حنیف شاہد (ص ۳۸)۔

کہ وہ اس حلقہ سے دست کش ہو جائیں۔

ان حضرات کے فرقہ وارانہ اختلافات اس قدر گہرے اور شدید ہیں۔ قائدِاعظمؒ نے مذکورہ بالا واقعہ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ لیکن وہ اسلامی مملکت کی اصل و اساس کو پا چکے تھے۔ انہیں اس کا یقین تھا کہ اگر فرقہ وارانہ اختلافات سے بلند ہو کر، قرآن مجید کو اسلامی اور غیر اسلامی کا معیار و مدار قرار دے لیا جائے تو اُمت میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ انہوں نے نومبر ۱۹۳۹ء میں قوم کے نام پیغامِ عید میں کہا تھا کہ:۔

جب ہمارے پاس قرآنِ کریم ایسی مشعلِ ہدایت موجود ہے تو پھر ہم اس کی روشنی میں ان اختلافات کو کیوں نہیں مٹا سکتے۔ (تقاریر۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۱۰۸)

یہ خود قرآنِ کریم کے اس ارشاد کی وضاحت ہے کہ: وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (۴۲/۱۰) تم میں اگر کسی بات میں اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ خدا (کی کتاب) سے لو۔ اس سے اختلاف مٹ جائے گا۔ اس حقیقت کو قائدِاعظمؒ نے، دسمبر ۱۹۴۳ء کے کراچی مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے خطاب میں واضح تر الفاظ میں بیان کیا تھا۔ انہوں نے پہلے خود ہی یہ سوال اٹھایا کہ:۔

وہ کونسا رشتہ ہے جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں۔ وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی ملّت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کونسا لنگر ہے جس سے اس اُمت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے۔

اس کے بعد خود ہی ان سوالات کا جواب ان الفاظ میں دیا:۔

وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر، خدا کی کتابِ عظیم قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔
ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسول، فلہٰذا ایک قوم۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ صفحہ ۵)

میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ قائدِاعظمؒ کے سامنے یہ حقیقت آئینے کی طرح عیاں، واضح اور شفاف تھی کہ اسلامی مملکت اسے کہا جائے گا جو قرآنِ کریم کے ابدی اور غیر متبدل اصول اقدار کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنا کاروبارِ حکومت سرانجام دے۔ اس حقیقت کو انہوں نے جن واشگاف الفاظ میں، ۱۹۴۱ء میں، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد (دکن) کے طلبا کو انٹرویو دیتے ہوئے بیان کیا تھا، مجھے (علامہ اقبالؒ کے سوا) اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ میں اس انٹرویو کو اس سے پہلے بھی متعدد بار پیش کر چکا ہوں، لیکن وہ ایسا اہم اور بنیادی ہے کہ میں اسے سینکڑوں بار دہرانے کے لئے کسی معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اور موجودہ حالات میں تو اس کے عیاں اور بیاں کرنے کی ضرورت اور بھی شدید ہو گئی ہے کہ ملتِ پاکستانیہ اس نصب العین سے دور ہٹتی جا رہی ہے، اور مجھے خدشہ ہے کہ اگر حالات کی رفتار ایسی ہی رہی تو وہ نصب العین ان کی نگاہوں سے یکسر اوجھل ہو جائے گا (یا کر دیا جائے گا)۔ بنا بریں، میں اپنا فریضہ سمجھتا ہوں کہ جب تک

حیدرآباد کا انٹرویو

میرے دم میں دم ہے، اس حقیقت کو بتوفیق ایزدی، دھرائے چلا جاؤں ؎

عزل سرائم و پیغام آشنا گویم
بایں بہانہ دریں بزم محرمے جویم

اس انٹرویو میں ان طلبا نے پہلا سوال یہ کیا کہ مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں۔ اس کے جواب میں قائداعظمؒ نے فرمایا:۔

جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور قوم کے محاورہ کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقیّد مفہوم یا تصور نہیں ہے۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں، نہ مُلّا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآنِ مجید اور قوانینِ اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآنِ کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریقِ کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے، اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔

سوال:۔ اس سلسلہ میں اشتراکی حکومت وغیرہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:۔ اشتراکیت، بالشویت یا دیگر اسی قسم کے سیاسی اور معاشی مسلک دراصل اسلام اور اس کے نظامِ سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا ربط اور تناسب و توازن نہیں پایا جاتا۔

اس کے بعد ان طلبا نے یہ سوال کیا کہ ترکی حکومت ایک مادی حکومت (سیکولر اسٹیٹ) ہے۔ کیا اس سے اسلامی حکومت مختلف ہے؟ سوال آپ نے سن لیا۔ اب قائداعظمؒ کا جواب سنیئے اور غور کیجئے کہ کیا اس قدر جامع اور مانع الفاظ میں اسلامی حکومت کا صحیح تصور کہیں اور بھی ملتا ہے؟ فرمایا:۔

میرے خیال میں ترکی حکومت پر مادی حکومت کی سیاسی اصطلاح اپنے پورے مفہوم میں منطبق نہیں ہوتی۔ اب رہا اسلامی حکومت کے تصور کا امتیاز، سو یہ بالکل واضح ہے۔ اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد ان طلبا نے سوال کیا کہ وہ مملکت یہاں ہندوستان میں کس طرح مل سکتی ہے؟ اس کے جواب میں آپ نے کہا کہ "مسلم لیگ۔ اس کی تنظیم اور اس کی جدوجہد، اس کا رخ، اس کی راہ، سب اس سوال کے جواب ہیں" اس جواب کے مختصر الفاظ میں تحریکِ پاکستان کی پوری غرض و غایت اور مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ سمٹ کر سامنے آ جاتا ہے۔ اس کے بعد طلبا نے ایک دلچسپ سوال کر ڈالا۔ لیکن قائداعظمؒ نے اس کے جواب میں جو کچھ فرمایا اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ علامہ اقبالؒ کی ہم نوائی میں وہ بھی اس سے متفق تھے کہ

میں جانتا ہوں انجام اس کا جس معرکے کے، مُلّا ہوں غازی

آپ، وہ سوال اور اس کا جواب ملاحظہ فرمایئے:۔

سوال:۔ جب آپ اسلامی اصول کے نصب العین اور طریقِ کار دونوں میں بہترین حکومت کا یقین رکھتے ہیں اور اجمالاً یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو خود مختار علاقے اس لئے مطلوب ہیں کہ وہاں وہ اپنے ذہنی میلانات اور تصوّراتِ زندگی کو بلا روک ٹوک بروئے کار اور روبہ ترقی لا سکیں، تو پھر اس میں کونسا امر مانع ہے کہ مسلم لیگ زیادہ تفصیل اور توضیح کے ساتھ اپنی جدوجہد کی مذہبی تعبیر و تشریح کر دے؟

جواب:۔ دقّت یہ ہے کہ جب اس جدوجہد کو مذہب سے تعبیر کیجئے تو ہمارے علماء کی ایک جماعت، بغیر اس بات کے سمجھنے کے کہ کام کی نوعیت، تقسیمِ عمل اور اس کے اصلی حدود کیا ہیں، ان امور کو صرف چند مولویوں کا اجارہ خیال کر لیتی ہے، اور اپنے حلقہ سے باہر اہلیت و استعداد کے باوجود مجھ میں یا آپ میں (یعنی ان کے اپنے سوا کسی اور میں) اس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی۔ حالانکہ اس منصب کی بجا آوری کے لئے جن اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے، انہیں میں، ان مولوی صاحبان میں (الّا ماشاءاللّٰہ) نہیں پاتا۔ (اور مشکل اندر مشکل یہ کہ) وہ اس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔

تھیاکریسی نہیں ہوگی

یہی وجہ ہے جو تشکیلِ پاکستان کے بعد قائدِاعظمؒ نے ساری دنیا سے برملا کہہ دیا تھا کہ مملکتِ پاکستان میں تھیاکریسی نہیں ہوگی۔ چنانچہ انھوں نے فروری ۱۹۴۸ء میں بہ حیثیت گورنر جنرل پاکستان، اہلِ امریکہ کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں کہا:۔

پاکستان، کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ مَیں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیا ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار، جمہوری انداز کا ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اُسی طرح عملی زندگی پہ منطبق ہو سکتے ہیں۔ جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلے میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں، ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو، یہ مسلّمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی، جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ

(بزعمِ خویش) ہماری مشن کو پورا کریں۔ (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل۔ ص۶۵)

پاکستان کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا تھا کہ یہ مملکت ایسے دو خطوں پر مشتمل ہے جن میں ہزار میل کا بُعد ہے۔ ایسے دو خطوں میں وحدتِ حکومت کس طرح ممکن ہوگی۔ قائداعظمؒ نے اس سوال کا جواب اپنے اس براڈکاسٹ میں دیا جسے انہوں نے ۱۹؍فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے باشندوں کے نام نشر کیا تھا۔ اس میں انہوں نے پہلے یہ فرمایا:۔

> مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان سے قریب ایک ہزار میل کے فاصلہ پر ہے اور ان کے درمیان مملکتِ ہند کا علاقہ حائل ہے۔ بیرونی ممالک کے ایک طالب علم کے دل میں جو پہلا سوال اُبھرے گا وہ یہ ہوگا کہ ایسی مملکت کا قیام کس طرح ممکن ہوگا۔ ایسے دو خطوں میں، جن میں اس قدر بُعد ہو، وحدتِ حکومت کس طرح ممکن ہوگی۔ میں اس سوال کا جواب صرف ایک لفظ میں دوں گا۔ اور وہ یہ کہ ایسا ہمارے ایمان کی رُو سے ہوگا۔ ایمان خدا پر، ایمان اپنے آپ پر، ایمان اپنے مستقبل پر۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ ہم سے اچھی طرح واقف نہیں، وہ ایسے مختصر سے جواب کا پورا پورا مفہوم سمجھ نہیں سکیں گے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل بھی بیان کر دوں۔

اس کے بعد انہوں نے فرمایا:۔

> پاکستان کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمدؐ رسول اللہ کی تعلیم کے پیرو ہیں۔ ہم اس اسلامی برادری کے ارکان ہیں جس میں حقوق، شرف و احترام اور تکریمِ ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ بنابریں ہم میں اخوت اور وحدت کا بڑا گہرا جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم و روایات۔ ہم اپنے نظریاتِ زندگی، نقطۂ نگاہ اور احساس دروں کے مالک ہیں اور یہی ہیں وہ عوامل جو قومیت کی تشکیل کا مدار بنتے ہیں۔ (ان بنیادوں پر ہم ایک قوم بنتے ہیں۔) (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل۔ ص۵۸)

اس براڈکاسٹ میں ایک نکتہ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ انہوں نے کہا یہ ہے کہ ہم مشرق میں ہوں یا مغرب میں، ہمارے ملّتِ واحدہ ہونے کی ضمانت یہ ہے کہ ہم سب ایک رسولؐ کی اُمّت ہیں۔ دین میں اطاعت تو قوانینِ خداوندی کی ہوتی ہے، لیکن اُمّت کی تشکیل رسولؐ کی طرف نسبت اور اس پر ایمان کی رو سے ہوتی ہے۔ بنابریں، ایک رسولؐ پر ایمان لانے کا لازمی اور فطری نتیجہ وحدتِ اُمّت ہونا چاہیئے۔ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کر دیا جب کہا کہ: إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا

اُمّتِ محمدیہؐ کی وحدت

دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ...... (۶/۱۶۰) "جو لوگ دین میں تفرقہ پیدا کر دیں، اور اس طرح فرقوں میں بٹ جائیں تو، اے رسولؐ! تیرا ان سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔" دین میں تفرقہ صرف مذہبی اختلافات کی بنا پر پیدا نہیں ہوتا۔ امتِ واحدہ کا کسی وجہ سے مختلف ٹکڑوں میں بٹ جانا، دین

میں تفرقہ ہے۔ وطنی، جغرافیائی یا نسلی بنیادوں پر مسلمانوں کا الگ الگ قوموں میں تقسیم ہو جانا۔ ذاتوں اور برادریوں کی بنا پر ان کا مختلف حصوں میں بٹ جانا۔ مذہبی فرقوں کی رو سے ان کا الگ الگ تشخص قائم کر لینا۔ سیاسی مقاصد کے لئے الگ الگ پارٹیاں بنا لینا، حتیٰ کہ مغربی انداز جمہوریت کی رو سے، ایک ہی ایوان میں حزبِ اقتدار اور حزبِ مخالف کے گروہوں میں تقسیم ہو جانا، یہ سب دین میں تفرقہ کے مرادف ہیں۔ ایک ضابطۂ قوانین (خداوندی) کے مطیع اور ایک رسول کی طرف نسبت سے امت بننے والے افراد میں تفرقہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا۔ اسی لئے قائداعظمؒ نے کہا تھا کہ مشرق اور مغربی پاکستان میں ہزار بُعد و مسافت ہو' جب ہم ایک ضابطۂ قوانین کے تابع اور ایک رسول کی اُمت کے افراد ہیں تو ہم میں اختلافات پیدا ہو ہی نہیں سکیں گے؀ انہوں نے ۱۷ر اپریل ۱۹۴۸ء کو گورنمنٹ ہاؤس، پشاور، میں ایک قبائلی جرگہ سے گفتگو کے دوران فرمایا تھا کہ:-

> ہم مسلمان، ایک خدا۔ ایک کتاب (قرآن مجید) اور ایک رسولؐ پر ایمان رکھتے ہیں اس لئے ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے صف بستہ کھڑے ہونا ہوگا۔ (تقاریر گورنر جنرل۔ صفحہ ۱۲۶)

انہوں نے ۱۴ر فروری ۱۹۴۸ء کو سبی دربار میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ:-

> میرے پیشِ نظر ہمیشہ اسلامی ڈیماکریسی کا اصول رہا ہے۔ یہ میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات کا راز ان سنہرے اصولوں کے اتباع میں ہے جنہیں ہمارے مقننِ اعظم، حضورؐ نبی اکرم نے ہمیں عطا فرمایا ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنی ڈیماکریسی کی بنیاد حقیقی اسلامی نظریات اور اصولوں پر رکھنی چاہیئے۔
> (تقاریر گورنر جنرل۔ صفحہ ۵۶)

تقسیم ہند کے عواقب میں، جب انگریز۔ ہندو اور سکھوں کی سازش نے ہمارے خلاف قیامت برپا کر دی تھی تو قوم شکستہ خاطر سی ہو رہی تھی۔ عین اس حالت میں آپ نے، ۳۰ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو یونیورسٹی سٹیڈیم، لاہور، میں تقریر کرتے ہوئے قوم کا حوصلہ بندھایا اور کہا کہ یاد رکھو:-

> ایسے نامساعد حالات میں بھی اگر ہم نے قرآن مجید سے بصیرت اور راہنمائی حاصل کی تو میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ آخرالامر فتح ہماری ہی ہوگی۔ (تقاریر گورنر جنرل۔ صفحہ ۳۱)

ایسا محکم تھا قائداعظمؒ کا ایمان قرآن مجید پر۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، ہمارے اس سال بھر کے جشن کی تقریبات میں کسی نے، قائداعظمؒ کی زندگی اور منہاجِ سیاست کے سلسلہ میں قرآن کا نام تک نہیں لیا۔ حالانکہ، جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں، یہ سب کچھ ان کی تقاریر اور بیانات میں موجود تھا۔ لیکن مقامِ حیرت و مسرت

؀ اگر ہم مملکتِ پاکستان کی بنیاد قرآنِ مجید پر رکھتے اور اس کی تعلیم کو عام کرتے جاتے تو ہو نہیں سکتا تھا کہ مشرقی پاکستان علیحدہ ہو جاتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے قرآن کریم کے رشتہ سے امتِ واحدہ ہونے کے اصول و نظریہ کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا اور وطن اور نسل کی تفریق کے تصور کو عام ہونے دیا۔ اس کا لازمی نتیجہ تشتت و افتراق تھا۔

ہے کہ یہ بات ایک غیر مسلم دانشور کی سمجھ میں آ گئی۔ ابھی حال ہی میں، جرمنی میں، پاکستان ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام، قائدِاعظمؒ کے جشنِ صد سالہ کی ایک تقریب منائی گئی۔ اس میں ایک جرمن سکالر، پروفیسر ڈاکٹر (KRAHNEN) نے اپنی تقریر کے دوران کہا کہ:-

قائدِاعظم محمد علی جناحؒ کے سامنے ماڈل، قرآن مجید تھا۔ (پاکستان ٹائمز - ۳ر فروری ۱۹۷۶ء)

*

یہ تھا عزیزانِ من! قائدِاعظمؒ کے پیشِ نظر اس مملکت کا تصوّر جس کے حصول کے لئے وہ دس سال تک مصروفِ جہاد رہے، اور جس پر انہوں نے اپنا آخری قطرۂ خون تک نچھاور کر دیا۔ میں اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ تشکیلِ پاکستان کے وقت، ان کے ذہن میں پورا تصور اور نقشہ موجود تھا کہ یہ مملکت صحیح معنوں میں اسلامی کس طرح بن سکے گی۔ قطعِ نظر میری ان ذاتی معلومات کے آپ سوچئے کہ جو شخص دس سال تک مسلسل اور متواتر وہ کچھ کہتا رہا ہو جس کا مختصر سا تذکرہ مَیں نے اس نشست میں کیا ہے، اگر اسلامی مملکت کا صحیح تصور اس کے ذہن میں نہیں ہوگا تو اور کس کے ذہن میں ہوگا؟ وہ اس تصور کو اپنے ساتھ لے کر یہاں آئے تھے۔ انہوں نے یہ تمام جد و جہد کی ہی اسی مقصد کے لئے تھی۔ کیا آپ کو ان کے وہ الفاظ یاد نہیں جو انہوں نے ۱۰ر مارچ ۱۹۴۱ء کو مسلم یونیورسٹی یونین علی گڑھ سے خطاب کرتے وقت کہے تھے کہ:-

اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس ملک سے اسلام کا نام و نشان نہ مٹ جائے تو اس کے لئے پاکستان نہ صرف یہ کہ ایک عملی نصب العین ہے، بلکہ یہی اور صرف یہی واحد نصب العین ہے۔

(تقاریر - جلد اول - صفحہ ۲۶۷)

اور اس کے ساتھ ہی وہ الفاظ جو انہوں نے ۲۳ر مارچ ۱۹۴۵ء کو پاکستان ڈے کی تقریب پر پیغام دیتے ہوئے ارشاد فرمائے تھے کہ:-

ہماری حفاظت، ہماری نجات اور عزت و آبرو (کے تحفظ کا واحد ذریعہ) پاکستان ہے۔ اگر ہم اس جد و جہد میں ناکام رہ گئے تو ہم تو تباہ ہو ہی جائیں گے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس برصغیر میں نہ مسلمانوں کا وجود باقی رہے گا، نہ اسلام کا نام و نشان۔

(تقاریر - جلد دوم - صفحہ ۲۵۵)

یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے قائدِاعظمؒ نے اس مملکت کو حاصل کیا تھا اور جسے اپنے قلب و دماغ کی گہرائیوں میں لئے، وہ پاکستان آئے تھے۔ لیکن اس کے بعد جس قسم کی بدنصیبی اور سوختہ بختی ہمارے حصے میں آئی، میرے خیال میں اس کی مثال تاریخِ عالم میں کہیں نہیں ملے گی۔ ایک تو پریشانیوں اور مشکلات کا وہ ہجوم جو سیلاب کی طرح ہمارے پیچھے پیچھے اُمنڈ کر ادھر آ گیا۔ دوسرے موت کا وہ عفریت جسے قائدِاعظمؒ نے نہ معلوم کس قوتِ ارادی سے اتنے عرصہ تک اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیا تھا۔ ان آفات و مصائب کی وجہ سے انہیں ایک ثانیہ کے لئے بھی سکون میسّر نہ آ سکا۔ اگر انہیں تھوڑا سا بھی اطمینان کا وقت مل جاتا تو

اسلامی مملکت کا جو تصور ان کے ذہن میں تھا وہ اسے قوم کے سامنے پیش کر دیتے۔ لیکن وائے بر حالِ ما کہ ایسا نہ ہو سکا اور نہ صرف یہ کہ یہاں اسلامی مملکت قائم نہ ہو سکی بلکہ "شاہیں کا نشیمن زاغوں کے تصرف" میں آ گیا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ قائدِ اعظمؒ اپنی تمام جد و جہد کے دوران، قرآن۔ قرآن پکارتے رہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ قرآن کے مخالفین، ایک دوسرے سے کہتے اور اپنے متبعین کو تاکید کرتے تھے کہ: لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ ـــ تم قرآن کو خود بھی نہ سنا کرو اور شور مچاتے رہا کرو ـــ تاکہ دوسرے بھی اسے نہ سن سکیں۔ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ۔ (۴۱/۲۶) بس یہی ایک طریقہ ہے جس سے تم قرآن کی طرف دعوت دینے والوں پر غالب آ سکتے ہو۔ تحریکِ پاکستان کے دوران قرآن کی آواز کو دبانے کے لئے یہی طریقِ کار مخالفینِ قرآن نے اختیار کر رکھا تھا۔ وہ شور مچاتے تھے کہ دیکھنا! ان لوگوں کے قریب نہ جانا۔ یہ تمہیں لے ڈوبیں گے۔ یاد رکھو۔

جو لوگ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں، اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے اور اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی، تو ان کا یہ گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ اس کا نام حکومتِ الٰہی رکھنا اس پاک نام کو ذلیل کرنا ہے۔

یہ تمہارے لیڈر۔ یہ ان کا قائدِ اعظمؒ۔ یہ تمہیں اسلامی مملکت بنا کر دینے کا چکمہ دیتے ہیں۔ یاد رکھو۔

ان کے خیالات۔ نظریات۔ طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خورد بین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی۔ ..... قائدِ اعظمؒ سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے پرکھتا ہو۔

وہ قرآن کی آواز پر لبیک کہنے والوں کے متعلق کہتے کہ:۔

اگر انہوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں، ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھا بھی ..... تو ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے۔

وہ قرآن کی طرف دعوت دینے والوں سے کہتے کہ اگر یہی آپ کا مسلک اور مقصد ہے تو:۔

آپ اپنی قوم کا جو نام چاہیں تجویز فرما لیں، اسلام کا نام تجویز کرنے کا آپ کو حق حاصل نہیں۔

پھر وہ کہتے:۔

جو کچھ یہ لوگ کرنا چاہتے ہیں شوق سے کریں۔ ہم ان کا راستہ روکنے نہیں آتے۔ ہمارا مطالبہ اُن سے صرف یہ ہے کہ وہ اسلام اور مسلمان کے نام کو غلط طریق پر استعمال کرنا چھوڑ دیں۔[1]

---

[1] ان تمام اقتباسات کے حوالوں کے لئے دیکھئے میرا پمفلٹ "اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش"

آپ کو معلوم ہے کہ قرآنی مملکت کے قیام کے خلاف یہ شور مچانے والے کون تھے؟ یہ تھے سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔

ان حضرات کی طرف سے یہ کہہ کر فریب دیا جاتا ہے کہ مودودی صاحب نے یہ کچھ اس زمانے میں کہا تھا جب مسلم لیگ کی طرف سے اس امر کا اظہار اور اعلان نہیں کیا گیا تھا کہ پاکستان کا نظام اسلامی ہوگا۔ چنانچہ مودودی صاحب نے خود یہ لکھا تھا کہ:-

> مسلم لیگ کے کسی ریزولیشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمحِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔ (سیاسی کشمکش۔ حصہ سوم۔ صفحہ ۱۳۱-۳۲)

لیکن دیکھئے کہ اس جھوٹ اور فریب کی قلعی کس طرح کھلتی ہے ـــــ اور کھلتی بھی ہے کس کی زبان سے؟ خود مودودی صاحب کی زبان سے۔ انہوں نے اپنے تفصیلی بیان میں جو نوائے وقت بابت ۱۴ اگست ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا تھا، لکھا کہ:-

> اس تحریک کے آغاز ہی سے عام مسلمان یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کی تمناؤں کا مرکز، پاکستان ایک اسلامی ملک ہوگا جس میں اسلام کا قانون جاری ہوگا اور اسلامی تہذیب زندہ کی جائے گی۔ اس لئے ان کا نعرہ یہ تھا کہ ـــــ پاکستان کا مطلب کیا ـــ لا الٰہ الا اللہ۔ مسلم لیگ کے لیڈر بھی اپنی تقریروں میں یہی خیال ظاہر کر رہے تھے۔ اور سب سے بڑھ کر خود قائداعظم مرحوم و مغفور نے مسلمانوں کو یقین دلایا تھا کہ پاکستان کا دستور قرآنی ہوگا۔

قائداعظمؒ کی اس یقین دہانی کی توثیق ان علماء کی زبان سے بھی ہوتی تھی جو خوش قسمتی سے تحریکِ پاکستان کے ہم نوا تھے۔ چنانچہ علامہ شبیر احمد عثمانی (مرحوم و مغفور) نے، صوبہ پنجاب کی جمعیت علمائے اسلام کی کانفرنس (لاہور) منعقدہ ۲۵ - لغایت ۲۷ جنوری ۱۹۴۶ء کے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا کہ:-

> اب آپ نے سمجھ لیا کہ پاکستان کیا ہے۔ اگر یہ پاکستان بن گیا تو وہاں نظامِ حکومت کس قسم کا ہوگا، اس کے متعلق ہم سرِدست بدوں تفصیلات میں جائے انہی اعلانات پر اکتفا کرتے ہیں جو آل انڈیا مسلم لیگ کے قائد مسٹر محمد علی جناحؒ، اس کے جنرل سیکرٹری نوابزادہ لیاقت علی خان اور اس کی مجلس عمل کے صدر نواب محمد اسمٰعیل خان صاحب وقتاً فوقتاً کرتے رہے ہیں کہ سرزمین پاکستان میں قرآنِ کریم کے سیاسی اصولوں کی بنیادوں پر اسلام کی حکومتِ عادلہ قائم ہوگی۔ (تجلیاتِ عثمانی از پروفیسر محمد انوار الحسن)

لیکن مودودی صاحب اس قدر واضح اعلانات، اور اب خود اپنے اعتراف کے باوجود کہ انہیں شروع ہی سے معلوم تھا کہ پاکستان کا دستور قرآنی ہوگا، یہ کہہ کر اس تحریک کی شدت سے مخالفت کرتے تھے کہ:-

(پاکستان میں) مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت۔

(سیاسی کشمکش۔ جلد سوم۔ صفحہ ۳۲-۱۳۱)

بالفاظِ دیگر، مودودی صاحب کے نزدیک جس مملکت کا دستور قرآنی ہو اس میں حکومت کافرانہ ہوتی ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت! (استغفراللہ) اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ ان صاحب کو قرآنی دستورِ مملکت سے کس قدر بُغض اور عناد ہے۔ اور وہ اس کی مخالفت میں کس طرح ایڑھی سے چوٹی تک کا زور لگا رہے تھے۔

آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے اس مخالفت کو کب تک جاری رکھا؟ قیامِ پاکستان کا اعلان تو ۳؍ جون سنہ ۱۹۴۷ء کو ہوا تھا لیکن اس سے کچھ عرصہ پہلے ہی سے اس کا عام چرچا ہو رہا تھا—وسط اپریل سنہ ۱۹۴۷ء میں ٹونک میں جماعتِ اسلامی کا ایک اجلاس ہوا جس میں اس جماعت کے وابستگان میں سے ایک صاحب نے مودودی صاحب سے کہا کہ ہمیں مسلم لیگ کی حمایت کرنی چاہیئے۔ اس کے جواب میں انہوں نے ان صاحب سے کہا کہ:-

جب ایک تحریک کو آپ خود غیر اسلامی مان رہے ہیں تو پھر کس منہ سے ایک مسلمان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کا ساتھ دیا جائے۔

یعنی جس تحریک کے متعلق اب یہ خود کہہ رہے ہیں کہ اس کے قائد نے شروع ہی سے کہہ دیا تھا کہ اس کا دستور قرآنی ہوگا، اس تحریک کو یہ اپریل سنہ ۱۹۴۷ء میں بھی "غیر اسلامی" قرار دے کر، اس کی مخالفت اپنا فریضہ قرار دیتے تھے۔ اگر یہ قرآن سے کھلا ہوا بغض و عناد نہیں تو اور کیا ہے؟ قرآن سے اسی قسم کا عناد ایک اور گروہ کو بھی تھا اور اس کا نام تھا ہندو سنگھٹن۔ اس گروہ کے ایک سربرآوردہ لیڈر، مسٹر منشی نے، سنہ ۱۹۴۱ء میں اکھنڈ بھارت کانفرنس کے اجلاس کے خطبۂ صدارت میں کہا تھا:-

تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان کیا ہے؟ نہیں معلوم تو سُن لیجئے کہ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے مسکن بنا لیں جہاں زندگی اور طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے ڈھانچے میں ڈھل سکیں اور جہاں اُردو ان کی قومی زبان بن سکے۔ مختلف الفاظ میں یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایک ایسا خطۂ ارض ہوگا جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔

(ٹریبون۔ ۲؍ نومبر سنہ ۱۹۴۱ء)

یعنی قائداعظمؒ پاکستان میں قرآنی نظامِ مملکت قائم کرنا چاہتے تھے اور ہندو قوم اور مودودی صاحب کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوتی تھی۔ يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ۔ (۶۱/۸) یہ لوگ تہیہ کر چکے تھے کہ قرآن کی شمعِ نورانی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں۔ لیکن خدا نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ اس نور کو

مکمل کرکے رہے گا خواہ اس کے مخالفین پر یہ امر کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گذرے۔

ہندو تو ہندوستان میں رہ گئے لیکن مودودی صاحب پاکستان تشریف لے آئے۔ یہاں بھی انہوں نے اپنی اس مخالفت کو برابر جاری رکھا۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قائدِاعظمؒ، تشکیلِ پاکستان کے بعد جتنے دن زندہ رہے انہوں نے کس طرح اس حقیقت کو ہر موقعہ اور ہر تقریب پر دہرایا کہ یہاں قرآنی آئین اور اسلامی نظام قائم کیا جائے گا۔ حتیٰ کہ انہوں نے قیامِ پاکستان کے بعد بہ حیثیتِ گورنر جنرل، کارپردازانِ حکومت سے اپنے اوّلین خطاب (اکتوبر ۱۹۴۷ء) میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں دہرایا کہ:-

> پاکستان کا قیام جس کے لئے ہم گذشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے، اب خدا کے فضل سے ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آ چکا ہے۔ لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں ہم اپنی روشنی، اور ثقافت کے مطابق نشوونما پا سکیں اور اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر روبہ عمل لائے جا سکیں۔ (تقاریر بہ حیثیتِ گورنر جنرل۔ صـ۲۲)

وہ یہ کہہ رہے تھے اور مودودی صاحب لوگوں کو پاکستان کی فوج میں بھرتی ہونے سے یہ کہہ کر روک رہے تھے کہ:-

> حکومتِ پاکستان غیر اسلامی ہے۔
> (نوائے وقت۔ ۳۱ اکتوبر ۱۹۴۸ء)

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندو پاکستان پر حملہ کرنے کی سوچ رہا تھا۔

اور وہ اب تک مسلسل اس کی مخالفت میں سرگرمِ عمل ہیں، اور اس میں ان کے ساتھ وہ تمام عناصر شامل ہیں جنہوں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ ان کے باہمی اتحاد میں یہی ایک قدرِ مشترک ہے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ ان کی ان مذموم مساعی کے باوجود یہ خطۂ زمین محفوظ رہے گا اس لئے کہ بہرحال یہ صحیح ہے کہ ——— نقشِ کہن ہو کہ نو منزلِ آخر فنا ہے

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

اور اس نقش میں تو اس مردِ خدا (علیہ الرحمۃ) کے خونِ جگر کی سرخیاں بھی جھلک دے رہی ہیں۔ اُس مردِ خدا کی عظمت کا اندازہ آپ اقبالؒ کی نگاہ سے لگائیے۔ ۱۹۳۸ء میں جب وہ بسترِ علالت پر تھے ایک دوست نے اُن کی درازیٔ عمر کی دعا کی۔ انہوں نے جواب میں لکھا کہ "میرا وقت اب پورا ہو چکا ہے اور میرا پیغام بھی ملت تک پہنچ چکا ہے۔ میرے لئے دعائے صحت مانگنے کے بجائے آپ قائدِاعظم محمد علی جناحؒ کی درازیٔ عمر کی دعا مانگیئے کہ انہوں نے ابھی اپنا مشن پورا کرنا ہے۔" والسلام

تتمّہ

پرویز صاحب کا خطاب تو سابقہ صفحات میں اختتام پر پہنچ گیا، لیکن انہوں نے اُس کے بعد کچھ اضافے فرمائے، جو اُن کے بعض نکات کی وضاحت کرتے ہیں۔ ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ انہیں بھی اس خطاب کے ساتھ تتمّہ کے طور پر شائع کر دیا جائے، تاکہ وہ بیک نظر قارئین کے سامنے آ جائیں۔

(۱)

علامہ اقبالؒ کی نگاہوں میں قائدِاعظمؒ کی عظمت کس قدر تھی، اس کا اندازہ آپ نے اِس سے لگا لیا ہوگا کہ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں اپنی عمر کے مقابلہ میں، قائدِاعظمؒ کی درازیٔ عمر کے لئے دعائیں مانگنے کی تلقین کی تھی۔ قائدِاعظمؒ کے نزدیک علامہ اقبالؒ کا مقام کیا تھا اس کا اندازہ اِس سے لگائیے کہ ان کی وفات پر قائداعظمؒ نے انہیں اپنا رفیق، رہنما اور مفکرؒ قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ "تحریکِ پاکستان کی تاریخ میں جو تاریک ترین دَور تھا وہ اس میں ایک چٹان کی طرح بخود خزیدہ، کھڑے تھے اور ایک لمحہ کے لئے بھی ان کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی تھی۔" انہوں نے ۲۵ مارچ ۱۹۴۰ء کو پنجاب یونیورسٹی ہال میں یومِ اقبال کی صدارت کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اگر میں ہندوستان میں اسلامی مملکت قائم ہونے کے وقت تک زندہ رہا اور اس وقت ایک طرف اس مملکت کی سربراہی کا منصب ہوا، اور دوسری طرف تصنیفاتِ اقبالؒ۔ اور مجھ سے کہا گیا کہ تم ان میں سے ایک چیز لے سکتے ہو تو میں تصانیفِ اقبالؒ کو ترجیح دوں گا۔" پھر انہوں نے یومِ اقبال منعقدہ ۹ دسمبر ۱۹۴۴ء کی تقریب پر اپنے پیغام میں کہا تھا:-

> علامہ اقبالؒ اگرچہ ایک عظیم شاعر اور فلسفی تھے، لیکن وہ عملی سیاستدان بھی کم پائے کے نہیں تھے۔ وہ اسلامی اصولوں پر ایمانِ کامل اور یقینِ محکم کی بنیاد پر اُن چند افراد میں سے تھے جنہوں نے سب سے پہلے یہ تصوّر پیش کیا کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مغربی علاقوں کو ہندوستان سے الگ کرکے ایک اسلامی مملکت متشکل کی جائے۔ میں اقبالؒ ڈے کی اس تقریب کے منانے میں بصمیمِ قلب آپ کے ساتھ شامل ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ ہم اقبالؒ کے پیش کردہ نصب العین پر پورے اُتریں تاکہ ہم اُن کے نظریات کو پاکستان کی آزاد مملکت میں عملاً متشکل کر سکیں، جب وہ مملکت وجود میں آئے۔

اِس سے ظاہر ہے کہ اقبالؒ اور قائدِاعظمؒ، اسلام کے حسین اور تابناک چہرے کی ایسی دو روشن آنکھیں تھیں، جن میں نظر کی وحدت ہوتی ہے اور ان کا نصب العین ایک ہوتا ہے۔

(۲)

قائداعظمؒ نے آل انڈیا مسلم لیگ کراچی کے اجلاس منعقدہ ۲۴ دسمبر ۱۹۴۳ء میں، حسبِ معمول ایک نہایت بلیغ اور بصیرت افروز خطاب ارزانی فرمایا۔ خطاب برجستہ تھا اور انگریزی میں۔ نواب بہادر یار جنگ (مرحوم) تحریکِ پاکستان کے شعلہ نوا مقرر تھے جن کا خطاب اسلامی اثر و ورد میں ڈوبا ہوا ہوتا تھا۔ قائداعظمؒ اپنے خطاب کو ختم کر کے بیٹھے تو نواب صاحب سے تقاضا ہوا کہ وہ اُردو میں تقریر فرمائیں۔ مجھے افسوس ہے کہ اِس وقت میرے سامنے ان کی تقریر کا اصل متن نہیں، اس کا انگریزی ترجمہ ہے۔ اس لئے میں اس کا اپنے الفاظ میں ترجمہ ہی پیش کر سکتا ہوں۔ انہوں نے فرمایا:-

> قائداعظمؒ متعدد بار اعلان فرما چکے ہیں کہ مسلمانوں کو کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی مملکت کے لئے خود کوئی آئین یا قانون وضع کریں۔ اسلامی مملکت کے آئین و قوانین متعین طور پر قرآنِ کریم کے اندر موجود ہیں۔ اِس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ ہم، پاکستان کا مطالبہ صرف اس لئے کرتے ہیں کہ ہم اُس میں قرآنی نظامِ حکومت نافذ کر سکیں۔ اِس سے ہماری زندگی میں انقلاب برپا ہو جائے گا۔ اس سے ہمیں تازہ حرکت اور حرارت میسر آ جائے گی اور سب سے بڑی چیز یہ کہ اِس سے اسلام کی مقدس عظمت کا احیاء ہو سکے گا۔

قائداعظمؒ نے اپنے خطاب میں کمیونسٹوں کو بھی اچھی طرح رگیدا تھا اور کہا تھا کہ وہ مسلمانوں سے دستبردار ہو جائیں۔ انہیں لیگ کے جھنڈے کے سوا کسی جھنڈے کی ضرورت نہیں۔ اسلام اُن کا راہ نما اور اُن کی زندگی کے لئے مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اُنہیں کسی اور ازم کی ضرورت نہیں۔ نواب بہادر یار جنگ نے اپنی تقریر میں کہا کہ:-

> اگر کمیونزم سے مقصود یہ ہے کہ دنیا سے مفلسی، غریبی اور طبقاتی امتیاز مٹا دیا جائے اور ہر ایک کو روٹی، کپڑا میسر آ جائے تو میں بھی اپنے آپ کو کمیونسٹ کہوں گا۔ لیکن اگر کمیونزم سے مراد کارل مارکس کا فلسفۂ زندگی ہے جس کی بنیاد ہستیٔ باری تعالےٰ کے انکار پر ہے تو میں اس کمیونزم سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ میں اس اسٹیج سے اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ جو لوگ اپنے معاشی نظام کی بنیاد وجودِ باری تعالیٰ کے انکار پر رکھنا چاہتے ہیں وہ براہِ کرم ہمارے اس پنڈال سے باہر نکل جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب ہماری پلاننگ کمیٹی اسلامی نظام کا خاکہ مرتب کرے گی تو وہ قرآن کی بنیادوں پر استوار ہو گا۔

نواب صاحب مرحوم باغ و بہار شخصیت کے پیکر تھے، اور ان کے مزاج میں انتہائی سنجیدگی اور وقار

کے ساتھ نہایت خوشگوار مزاج کا امتزاج بھی تھا۔ اس تقریر کو ختم کرنے کے بعد انہوں نے قائداعظمؒ کی طرف رخ کیا اور کہا:۔

قائداعظمؒ! ہم نے تو پاکستان کو ایسا کچھ سمجھا ہے۔ اگر آپ کا پاکستان ایسا نہیں تو معاف فرمائیے! ہمیں وہ پاکستان مطلوب نہیں۔

قائداعظمؒ نے اپنے تبسم دیرینہ کے ساتھ فرمایا کہ "کیا نواب صاحب مجھے چیلنج دے رہے ہیں"؟

نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا:۔

نہیں جناب! میں آپ کو چیلنج نہیں دے رہا۔ میں تو اس چیلنج کے ذریعے سامعین کو سمجھا رہا ہوں کہ قائداعظمؒ کے تصور کا پاکستان کیا ہے؟

کیسے حسین تھے وہ لمحات۔ ان کی یاد آج بھی ۲۳ مارچ کو نوروز کی سا حسن عطا کر دیتی ہے!

(۳)

قائداعظمؒ نے یکم مارچ ۱۹۴۵ء کو مسلم لیگ ورکرز سے کلکتہ میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے اتنا دے رکھا ہے کہ میں اپنے اس بڑھاپے کی زندگی کو نہایت آرام اور سہولت سے گذار سکتا ہوں۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں دن رات بھاگے بھاگے پھروں اور اپنا خون پسینہ ایک کر دوں۔ میں یہ تگ و تاز سرمایہ داروں کے لئے نہیں کر رہا۔ میں یہ محنت شاقہ آپ غریبوں کے لئے کر رہا ہوں۔ میں نے ملک میں دردانگیز مفلسی کے مناظر دیکھے ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ پاکستان میں ہر فرد خوشحالی کی باعزت زندگی بسر کر سکے۔

(۴)

موجودہ دور کی سیاست کا مدار ہی جھوٹ اور فریب، مکر اور عیاری پر ہے۔ لیکن قائداعظمؒ نے اپنی تگ و تاز میں سیاست کا ایک ایسا نقشہ پیش کیا جس میں مکر و فریب تو ایک طرف، مغالطہ آفرینی کا بھی شائبہ تک نہیں تھا۔ ویسے تو اس کے ثبوت میں بیسیوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن میں اس وقت صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔

۳ مارچ ۱۹۴۷ء کو پنجاب میں خضر حیات خان کی وزارت نے استعفےٰ دیا اور گورنر نے نواب ممدوٹ سے تشکیل وزارت کے لئے کہا۔ عددی اعتبار سے یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ مسلم لیگ اپنے ساتھ کچھ غیر مسلم اراکین کو ملا کر وزارت قائم کرتی۔ قائداعظمؒ کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی گئی اور ان سے کہا گیا کہ مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس وقت ایسا کر لیں اور جب آہستہ آہستہ مسلم لیگ طاقت پکڑ جائے تو پھر ان دوسرے ممبروں سے نبٹ لیا جائے۔

قائداعظمؒ اس پر سخت برافروختہ ہوئے اور تجویز پیش کرنے والے سے کہا کہ:۔

آپ کان کھول کر سن لیجئے کہ میں اس قسم کی سیاسی چالبازیوں اور مصلحت انگیز حربوں سے کبھی کام نہیں لینا چاہتا۔ میری سیاست ان سے بہت دور ہے۔ تم غیر مسلم ممبر کہتے ہو۔ میں تو غیر لیگی ممبروں کو بھی اپنے ساتھ شامل کر کے کابینہ بنانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ دو قومی نظریہ کے خلاف ہوگا۔ اور یہی نظریہ مطالبۂ پاکستان کی بنیاد

اس پر ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ نواب ممدوٹ نے وزارت متشکل کرنے سے انکار کر دیا۔ اور گورنر نے پنجاب میں آرڈیننس ۹۳ نافذ کر دی۔ چند ہی مہینوں کے بعد پاکستان وجود میں آ گیا اور نواب ممدوٹ نے پہلی لیگی وزارت قائم کر لی۔

یہ تھا قائد اعظمؒ کا وہ کردار جس کے بھروسے پر انہوں نے یہ اس قدر مہیب جنگ لڑی تھی اور جس کے بل بوتے پر پاکستان جیسی عظیم مملکت حاصل کر لی تھی ——— بزم ہو یا رزم ہو، پاک دل و پاک باز۔

(۵)

سیاست میں روباہی اور چالبازی تو ایک طرف، وہ اپنے قلب و دماغ پر جذبات کو بھی غالب نہیں آنے دیا کرتے تھے اور نازک سے نازک لمحات میں بھی الفاظ کے انتخاب میں بڑی احتیاط برتتے تھے۔ ایک وقت وہ آیا جب یہ خدشہ لاحق ہوا کہ انگریز ہندوؤں کے ساتھ مل کر مطالبۂ پاکستان کو مسترد کر دے گا۔ یہ بہت بڑا خطرہ تھا جو قائد اعظمؒ کے سامنے آیا۔ وہ اسلامیہ کالج لاہور کے میدان میں ایک پرہجوم جلسے سے خطاب فرما رہے تھے۔ ان کی تقریر میں بڑا جوش اور ولولہ تھا۔ انہوں نے بڑے زوردار الفاظ میں کہا کہ "اگر برطانوی حکومت نے ایسا کیا ......" اتنا کہنے کے بعد وہ رک گئے۔ سامعین ہمہ تن گوش تھے کہ نہ معلوم قائد اعظمؒ اس کے بعد کیا کہیں گے اور قوم کو کس قسم کے لائحہ عمل کے لئے تیار رہنے کا حکم دیں گے۔ لیکن قائد اعظمؒ نے ایک سیکنڈ تک رکنے کے بعد پھر وہی الفاظ دہرائے کہ "اگر برطانوی حکومت نے ایسا کیا ......" پھر رکے، اور تیسری مرتبہ فرمایا:-

اگر برطانوی حکومت نے ایسا کیا تو ہم ——— تو ہم اس کا مقابلہ کریں گے۔ (WE WILL RESIST)

آپ نے غور فرمایا کہ ایسے نازک لمحات میں بھی وہ اپنی ذمہ داریوں کے احساس کی بنا پر اپنے آپ پر کس قدر ضبط رکھنے کے اہل تھے، اور الفاظ کے انتخاب میں کس قدر احتیاط برتتے تھے۔ حالانکہ یہ شہر لاہور تھا اور سامعین وہ جو مولانا ظفر علی اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری (مرحومین) کی تلاطم خیز اور شعلہ انگیز یوں کے عادی ہی نہیں رسیا ہو چکے ہوئے تھے۔ قائد اعظمؒ کا یہی تو احتیاط تدبر تھا جس سے وہ قوم کی کشتی کو صحیح و سلامت ساحل مراد تک لے آئے۔

(۶)

اور آخر میں ایک غلط فہمی کا ازالہ ——— عام طور پر مشہور کیا جاتا ہے کہ قائد اعظمؒ ڈکٹیٹر تھے۔ وہ نہ کسی کی سنتے تھے، اور نہ کسی کو ان کے سامنے دم مارنے کی جرأت ہوتی تھی۔ وہ بلا چون و چرا اپنے فیصلوں کی اطاعت چاہتے تھے۔ قائد اعظمؒ کے متعلق یہ تصور نہ صرف غلط فہمی پر مبنی ہے بلکہ ان کے خلاف انتہائی سازش کا غماز۔ وہ کس مزاج کے انسان تھے اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے جو ان کے پرائیویٹ سیکرٹری سید مطلوب حسن صاحب نے بیان کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ

ایک مرتبہ ہندوستانی فوج کے ایک کپتان نے ایک محفل میں قائد اعظمؒ سے پوچھا کہ کیا پاکستان اقتصادی طور پر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہوگا؟ قائد اعظمؒ نے یہی سوال اس کپتان پر دہرایا۔ اس نے کہا کہ بیشک یہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائیگا۔ اس پر قائد اعظمؒ نے پوچھا کہ تم یہ کس بنا پر کہتے ہو؟ اس نے کہا کہ اس بنا پر کہ ہمارا قائد ایسا کہتا ہے۔ قائد اعظمؒ نے اس کی طرف غصہ بھری آنکھوں سے دیکھا اور کہا کہ یہ سن رکھو کہ آزاد پاکستان میں تم وہ پہلے افسر ہو گے جسے نوکری سے برطرف کر دیا جائے گا۔

بات واضح تھی۔ جو شخص اپنی کوئی رائے نہیں رکھتا، نہ ہی اس کے پاس اپنی رائے کی تائید میں دلائل و براہین ہیں اور وہ ایک بات کو صرف اس لئے مان لیتا ہے کہ اس کے لیڈر نے ایسا کہہ دیا ہے۔ قائد اعظمؒ کے نزدیک وہ شخص اس قابل ہی نہیں تھا کہ آزاد پاکستان میں کوئی ذمہ داری اس کے سپرد کی جا سکتی ——— اور یہ واقعہ کوئی استثنائی نہیں۔ قائد اعظمؒ کی ساری زندگی ایسی تھی۔ وہ خود بھی اپنے ہر دعویٰ کیلئے دلائل پیش کرتے تھے اور دوسروں سے بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ اپنی بات دلائل و براہین کی رُو سے پیش کریں ——— کیا اس کے بعد بھی کہا جائے گا کہ قائد اعظمؒ ڈکٹیٹر تھے؟ وہ اصول پرست ضرور تھے۔ ڈکٹیٹر مطلقاً نہیں تھے۔

یہ ہیں قائد اعظمؒ کے کردار کی چند جھلکیاں جنہیں پیش کرنے کے لئے میں نے ان فرصت کے لمحات کو غنیمت سمجھا۔ شکریہ!

بتقریب یومِ پاکستان

معرکۂ دین و وطن

(گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را)

(ہمارے ہاں چونکہ نہ تحریکِ پاکستان کی کوئی مستند تاریخ مرتب اور شائع ہوئی ہے اور نہ ہی قائداعظمؒ کی کوئی قابلِ اعتماد سوانح حیات، اس لئے ہماری نئی نسل تو اس حقیقت سے بالکل بے بہرہ ہے کہ اس تحریک کا مقصد کیا تھا، مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ کیا۔ کون کون سی قوتوں نے اس کی مخالفت کی اور قائداعظمؒ نے کس طرح یہ جنگ لڑائی یکہ و تنہا لڑی اور اس سے کامیاب و کامران باہر آئے۔ ہماری نئی نسل نہ صرف ان حقائق سے بے بہرہ ہے بلکہ وہ عناصر جنہوں نے پاکستان کی مخالفت کی تھی اور جو پاکستان میں موجود، اور اپنی خلافِ پاکستان سازشوں میں بدستور مصروف ہیں، ان (نوجوانوں) کے دل میں عجیب و غریب قسم کے شکوک و شبہات پیدا کرتے رہتے ہیں۔ پاکستان کی مستند تاریخ کے اصولی خط و خال، طلوعِ اسلام کے فائلوں میں ملفوف اور پرویز صاحب کے ذہن میں محفوظ ہیں، اس لئے ہم مختلف مواقع پر، ان کے مقالات و خطابات شائع کرتے رہتے ہیں کہ ہماری نئی نسل کے کانوں میں یہ آواز پڑتی رہے۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر ہم اشاعتِ حاضرہ میں، پرویز صاحب کا یہ خطاب شائع کر رہے ہیں جسے انہوں نے آج سے قریب تیرہ سال قبل ایک اجتماع میں پیش فرمایا تھا۔ جب تک ہمیں زمانے نے مہلت دی ہم اس داستان کو اسی طرح دہراتے رہیں گے ـــــــ چہ کند بے نوا ہمیں دارد۔)

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے میرے آج کے خطاب کا موضوع ہے "معرکۂ دین و وطن"۔ آپ میں سے جن حضرات نے تحریکِ پاکستان کی کش مکش کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یا جنہیں اس کی تاریخ سے دلچسپی رہی ہے، انہیں اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ اس موضوع سے مراد کیا ہے۔ اور دین و وطن کا یہ معرکہ کیا تھا۔ لیکن

موضوع کی اہمیت

ہماری موجودہ نسل کے نوجوان اس عنوان سے نہیں سمجھ سکیں گے کہ اس کا مفہوم کیا ہے۔ وہ کہیں گے کہ دین، دین ہے اور وطن، وطن۔ ان دونوں میں کسی قسم کا تزاحم و تصادم کس طرح ہو سکتا ہے جو اسے معرکہ سے تعبیر کیا جائے؟ دین اور وطن کے معرکے کے معنی ہی کچھ

نہیں ہو سکتے - ہمارے یہ نوجوان سچے ہیں - ہم نے نہ صرف آج تک تحریکِ پاکستان کی کوئی مستند تاریخ مرتب کی، اور نہ ہی قائدِاعظم (علیہ الرحمۃ) کی قابلِ اعتماد سوانح عمری شائع کی جس سے اس معرکہ کی تفاصیل سامنے آ سکتیں اور اس سے ہماری یہ اُبھرنے اور بڑھنے والی نسل سمجھ سکتی کہ وہ کیا جنگ تھی جو ہمارے قائد نے لڑی تھی اور کونسا معرکہ تھا جسے اس نے یکہ و تنہا، بایں جرأت و بسالت سر کیا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک اس جنگ کی علتِ غائی اور اس معرکے کے وجوہ و اسباب سامنے نہ آئیں نہ تحریکِ پاکستان کی غرض و غایت سمجھ میں آ سکتی ہے اور نہ ہی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیوں کیا تھا۔ اس جداگانہ مملکت کے وجود میں لانے سے مقصد کیا تھا۔ اگر یہ مملکت متشکل نہ ہوتی تو ہمارا کیا حشر ہوتا، اور اس کے متشکل ہو جانے سے ہمیں کیا حاصل ہوا۔ اور یہ واضح ہے کہ جب تک ہماری موجودہ (اور آئندہ) نسل کے سامنے یہ حقائق نہ آئیں نہ ان کے دل میں اس مملکت کی صحیح قدر و قیمت کا احساس پیدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی وہ اس کی حفاظت اور استحکام کے لئے کسی قربانی کے لئے بطیبِ خاطر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ میں نے قائدِاعظمؒ سے متعلق مختلف تقاریب کے سلسلہ میں جس قدر تقاریر کی ہیں، ان سے میرا مقصود یہی تھا اور آج کی تقریر سے بھی یہی مطلوب ہے۔

عزیزانِ من!

آپ نے لوگوں کو اکثر کہتے سنا ہوگا کہ فلاں شخص کی زندگی بڑی کامیاب ہے۔ جب انسان کے سامنے کوئی بلند مقصد نہ ہو تو کامیاب زندگی کا معیار سمٹ سمٹا کر یہ رہ جاتا ہے کہ:-

بی - اے کیا - نوکر ہوئے - پنشن ملی - اور مر گئے

کامیاب زندگی کا معیار

لیکن جن افراد یا اقوام کے سامنے زندگی کے بلند مقاصد ہوں، ان کے ہاں کامیاب زندگی کا معیار کچھ اور ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی انسان کی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کے ماپنے کا پیمانہ یہ ہے کہ جب وہ دنیا میں آیا تو اس نے اپنے ماحول کو کیسا پایا اور جب وہ یہاں سے گیا تو اس نے اس ماحول کو کس حالت میں چھوڑا۔ اگر اس نے اپنے ماحول اور معاشرہ کو اپنے پیشِ نظر مقصد کے لئے ناسازگار پایا تو اس کا بدل کیا تھا۔ جس زمانے میں ملوکیت کے استبداد کی وجہ سے ہماری قوتیں مفلوج اور ارادے مسلوب ہو چکے تھے، ہمیں، ہمارے معلمینِ اخلاق یہ سبق پڑھایا کرتے تھے کہ ــــــ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز ــــــ اگر زمانے کے حالات تمہارے مقصد کے لئے سازگار نہیں تو تمہیں چاہیئے کہ اپنے مقصد کو چھوڑ کر زمانے کے ساتھ چلنے لگو۔ لیکن قرآن کی تعلیم اس کے برعکس تھی۔ یہ وہ تعلیم تھی جسے علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:-

مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار   با مزاجِ او بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں   می شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیادِ موجودات را   می دہد ترکیبِ نو ذرات را
می کند از قوتِ خود آشکار   روزگارِ نو کہ باشد سازگار

یعنی اگر زمانے کے حالات اس صاحبِ عزم و ہمت کا ساتھ نہیں دیتے تو وہ زمانے کے دھارے کا رُخ بدل دیتا ہے اور اپنی مسلسل سعی و کاوش اور پیہم تگ و تاز سے اسے مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ چلے۔ اس لئے کہ ـــــ ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر ـــ اس حقیقت کو حضرت علامہؒ نے دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:ـ

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ — پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار — اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

آیئے ہم دیکھیں کہ آج ہم جس بطلِ جلیل کی یاد منانے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں، اس معیار کے مطابق اس کی زندگی کامیاب زندگی کہلا سکتی ہے یا نہیں۔

محمد علی جناحؒ کے شعور نے جب آنکھ کھولی تو اس نے دیکھا کہ اس کا ملک، انگریز کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اُس مردِ غیور و جسور کے لئے یہ احساس ناقابلِ برداشت تھا۔ اگر وہ زمانہ کے ساتھ چلنے کا مسلک

انگریز کے خلاف جنگ

اختیار کرتا تو وہ تمام مناصب و مدارج، جو اُس زمانے میں کسی ہندوستانی کو مل سکتے تھے، اس کے قدم چومتے۔ لیکن اس نے یہ روش اختیار نہ کی اور ملک کو انگریزی استعمار کی گرفت سے نجات دلانے کے لئے مصروفِ تگ و تاز ہو گیا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا دور تھا۔ جب انگریز کے استبداد کی گرفت ڈھیلی پڑنی شروع ہوئی تو اس کے سامنے ایک اور حقیقت، بے نقاب ہوئی جس سے اس کی زندگی کا ایک نیا دَور شروع ہوا۔ اور یہ وہ دَور ہے جس میں اسے ہندو، انگریز اور خود مسلمانوں کے ایک گروہ کے ساتھ چومکھی لڑائی لڑنی پڑی۔ یہی ہے وہ دَور جس میں اس کی صحیح عظمت ہمارے سامنے آتی ہے اور اس کی زندگی اس معیار پر پوری اُترتی ہے جسے ہم نے کامیاب زندگی کا معیار قرار دیا ہے۔

ہندو کے عزائم

جب ملک سے انگریز کی گرفت ڈھیلی پڑتی شروع ہوئی تو ہندو کے سینے میں چھپے ہوئے عزائم رفتہ رفتہ بے نقاب ہونے لگے۔ اس کی اسکیم یہ تھی کہ انگریز کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد، ہندوستان میں بسنے والے تمام افراد کو ایک قوم فرض کر کے، یہاں جمہوری انداز کی حکومت قائم کی جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ جمہوری اندازِ حکومت میں سارا اقتدار اور اختیار، اکثریت کے ہاتھوں میں رہتا ہے۔ اور اقلیت کو ان کے رحم و کرم پر زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو کے الفاظ میں:ـ

دراصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت، اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھنا چاہتی ہے۔ (میری کہانی ـ جلد دوم ـ صفحہ ۲۵۵)

لہٰذا ہندو کی اسکیم کی رو سے ہندوستان میں جمہوری حکومت کے معنی یہ تھے کہ یہاں مسلمان مستقلاً اور دائماً ہندوؤں کے محکوم رہیں ـــــ اسے فطرت کی ستم ظریفی کہئے یا مسلمان بادشاہوں کی کوتاہ نگہی کہ جس ملک پر مسلمانوں نے ہزار برس تک حکومت کی ہو وہاں یہ اقلیت میں ہوں۔ ہمارا مطلب یہ نہیں کہ مسلمان فرمانروا ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنا لیتے۔ ایسا کرنا تو قرآن کی رو سے جائز ہی نہیں۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ اگر ان حکمرانوں

میں ذرا بھی اسلامی نظریۂ زندگی کا شعور ہوتا اور یہ، یہاں کی دبی اور کچلی ہوئی انسانیت کے ساتھ (جسے ہندو دھرم نے حیوانوں سے بھی بدتر مقام دے رکھا تھا) ذرا سا بھی انسانی سلوک کرتے تو وہ خود بخود حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاتی اور آج ہندوستان کی سیاست کا نقشہ کچھ اور ہوتا، یہ تو خیر ضمنی بات تھی۔ واقعہ یہ تھا کہ ہندو کی اسکیم کے مطابق، مسلمان کو ہندوستان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندو کا غلام بن کر رہنا پڑتا تھا۔ یہ اسکیم اس مفروضہ پر مبنی تھی کہ ہندوستان کے تمام باشندے، محض ایک ملک میں بسنے کی وجہ سے، ایک قوم ہیں۔ قرآن کی رو سے یہ مفروضہ ہی غلط تھا۔ وہ قومیت کی تشکیل، وطن کے اشتراک کی رو سے نہیں کرتا، بلکہ آئیڈیالوجی کے اشتراک کی رو سے کرتا ہے۔ اس کے اس اصول کی رو سے صورت یہ تھی کہ مکہ کا رہنے والا، ابوجہل جو نہ صرف اس وطن کا باشندہ تھا جس وطن میں محمد رسول اللہ رہتے تھے بلکہ رنگ۔ نسل۔ زبان کے لحاظ سے بھی انہی میں سے تھا، ایک دوسری قوم کا فرد تھا اور روم کا صہیبؓ، حبش کا بلالؓ اور فارس کا سلمانؓ ایمان کے اشتراک کی بنا پر قرآنی اُمت کے افراد۔ وطن۔ رنگ۔ نسل۔ زبان کا اشتراک ابوجہل اور ابوبکرؓ کو ایک قوم کے افراد نہیں بنا سکتا تھا۔ تشکیلِ اُمت کا یہ وہ اصول تھا جسے حضرت ابراہیمؑ نے ان چار لفظوں میں سمٹا کر بیان کر دیا کہ: فَمَن تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي۔ (۱۴/۳۶) جو میری پیروی کرتا ہے وہ میرا ہے یہ تھا وہ معیارِ قومیت جسے قرآن نے چودہ سو سال پہلے پیش کیا تھا اور جس کی دعوت علامہ اقبالؒ برسوں سے دیتے چلے آ رہے تھے۔

نیشنلزم کی لعنت

انہوں نے مسلمانوں کو بہت پہلے متنبہ کیا تھا کہ:-

اس دَور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور — ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور — تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور!
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے — غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے — اسلام ترا دیس ہے تو مصطفویؐ ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے!
اے مصطفویؐ خاک میں اس بت کو ملا دے

انہوں نے اس حقیقت کا اعلان کھلے الفاظ میں کیا کہ:-

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمارؐ نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

انہوں نے اس مسلمان سے جو مغربی اندازِ سیاست سے متاثر ہو رہا تھا کہا کہ:-

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

اسی بنا پر انہوں نے کہہ دیا تھا کہ ہندوستان میں بسنے والا مسلمان، محض اشتراکِ وطن کی بنا پر ہندو کا ہم قوم نہیں ہو سکتا۔ یہاں کے تمام مسلمان، ایمان کے رشتے کی بنا پر ہندوؤں سے الگ ایک مستقل قوم ہیں اور اسی بنا پر وہ ایک الگ مملکت کا تقاضا کرتے ہیں۔ اقبالؒ نے یہ مطالبہ ۱۹۳۰ء میں پیش کیا تھا لیکن اس وقت اس پر کسی نے خاص توجہ نہ دی۔ اور (ہندو تو ایک طرف خود) مسلمانوں نے بھی اسے یہ کہہ کر درخورِ اعتنا نہ سمجھا کہ یہ محض ایک شاعر کا خواب ہے جسے حقیقت سے کچھ واسطہ نہیں۔ لیکن اب جو قائدِاعظمؒ نے اسی حقیقت کو پیش کیا تو ہندو کے قصرِ سیاست میں زلزلہ آ گیا۔ اس لئے کہ اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد،

مسلم قومیت کے خلاف ہندو کا محاذ

اس کا وہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا تھا جس کی رو سے وہ اپنی ہزاروں سال کی غلامی کا انتقام، مسلمانوں سے لینا چاہتا تھا۔ یہ تھا وہ پہلا محاذ جس پر قائدِاعظمؒ کو آزادی کی جنگ لڑنی پڑی۔ انہوں نے یہ آواز بلند کی تو چاروں طرف سے اس کے خلاف کائیں کائیں ہونے لگ گئی۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے، مارچ ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا نیشنل کنونشن کے خطبۂ صدارت میں کہا کہ:-

ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو، مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملکوں، اور دو قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں ہے۔

پھر انہوں نے اپنی سوانح عمری میں لکھا:-

مسلم قومیت کا تخیل صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پروازِ خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے۔

دوسری طرف سے مہاتما گاندھی نے پکارا کہ:-

میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباء و اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو۔ وہ، اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کریں کہ وہ اپنے آباء و اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان، اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا، تو اسلام کے بعد اسے ایک ہی قوم رہنا چاہیئے خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔ (گاندھی کا خط جناحؒ کے نام۔ مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۴ء)

ہندوؤں نے تو یہ کچھ کہنا ہی تھا کہ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اس سے ان کے تمام منصوبے خاک میں مل رہے تھے، لیکن حیرت اس پر تھی کہ خود مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد بھی اس باب میں ہندوؤں کی ہاں میں ہاں

نیشنلسٹ مسلمان

ملا رہی تھی۔ انہیں اس زمانے میں نیشنلسٹ مسلمان کہا جاتا تھا جن میں جمعیت العلماء ہند۔ سرحد کے سرخ پوش۔ مجلس احرار۔ بہار کے انصار وغیرہ سب شامل تھے۔ اور قائدِاعظمؒ کے اس مطالبہ کے خلاف، ہندوؤں کی فوج کے ہراول دستے کے طور پر میدانِ جنگ میں اتر آئے تھے چنانچہ صوبہ بہار کے، اس زمانے کے وزیر، ڈاکٹر سید محمود نے (جو اب ہندوؤں کے مظالم کے خلاف احتجاج کرنے

کے لئے ہندوستان میں مشاورتی مجالس قائم کر رہے ہیں)۔ یہاں تک کہہ دیا کہ:۔

لفظ ہندی کو ہندی زبان کے لئے نہیں بلکہ اہلِ ہند کے لئے اختیار کرنا چاہیئے۔ دنیا بھر میں صرف ہمارا ملک ہی ایسا ہے جس میں مختلف لوگ مذاہب کی رُو سے شناخت میں آتے ہیں۔ اس سے ہماری سیاسی کیفیت واضح طور پر سامنے آ جاتی ہے اور ہمارے متعلق یہ بات ثابت کر دیتا ہے کہ ہم اس برِاعظم کی علیحدہ علیحدہ مذہبی اقوام ہیں۔ اس لئے اب وقت آگیا ہے کہ ہم سب ایک مشترک نام اختیار کر لیں۔

یعنی ان کی تجویز یہ تھی کہ مسلمان (الگ قوم ہونا تو ایک طرف) اپنے آپ کو الگ نام (مسلمان) سے بھی نہ پکاریں۔ یہ اپنے آپ کو صرف ہندی کہیں ——— تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری ——— اُدھر سے، جناب جوش ملیح آبادی صاحب (جو اُس زمانے میں اپنا ماہنامہ کلیم نکالتے تھے اور اب پاکستان میں تشریف فرما ہیں) للکارتے ہوئے بولے:۔

اپنے آپ کو مسلم یا ہندو پہلے اور ہندوستانی بعد میں کہنا، جغرافی صداقت اور فطری قانون کے خلاف ہے۔ مذہب زیادہ سے زیادہ ایک ذہنی لباس ہے۔ لیکن قومیت اور وطنیت تو ہمارے بدن کی جلد ہے۔ بدن کی جلد کیسی؟ قومیت تو ہمارا گوشت، پوست اور ہمارا ضمیر ہے۔ لباس ہر وقت بدلا جا سکتا ہے لیکن پوست اور ضمیر کو کون بدل سکتا ہے، ایسا کیوں ہے۔ اس لئے کہ قومیت اور وطنیت ایک ایسی قدرتی چیز ہے جس کا تبدیل کر دینا طاقتِ بشری سے باہر ہے۔

(کلیم۔ دسمبر ۱۹۳۷ء)

حتیٰ کہ، دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) تک نے یہ کہہ دیا کہ "قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ یہ وہ زمانہ تھا جب علامہ اقبالؒ مرض الموت میں مبتلا، صاحبِ فراش تھے۔ ایک اتنے بڑے مذہبی عالم کی زبان سے، یہ اعلان ان کے قلبِ حساس پر نشتر بن کر گرا اور ایک آہ بن کر ان الفاظ کی شکل میں ان کے لبوں تک آ گیا کہ:۔

مولانا مدنی مرحوم

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ — زدیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است — چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی است!
بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

اس کے بعد جب مولانا مدنی (مرحوم) نے اپنا جواب شائع کیا، تو حضرت علامہؒ نے فرمایا:۔

اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بہ حیثیت ایک، سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں مسلمانوں کو بروقت انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اوّل تو لادینی ہوگا۔ اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پروائی۔

غرضیکہ میدانِ سیاست میں چاروں طرف سے اس طرح کے حملے ہو رہے تھے اور قائدِاعظمؒ (علامہ اقبالؒ کی وفات کے بعد) یکہ و تنہا ان تمام حملوں کا جواب دے رہے اور مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کہ نیشنلزم کا یہ

تصورِ ہندوستان میں انگریز کا جاری کردہ ہے۔ جسے ہندو نے اپنی خاص مصلحت کے ماتحت اپنا لیا ہے۔ یہ نظریۂ اسلام کے خلاف ہے اور ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کو تباہ و برباد کر دینے کا موجب۔ لیکن اس کے باوجود، یہ مخالفت مسلسل اور بدستور جاری تھی۔ اس مقام پر ضمناً یہ دیکھئے کہ وہی لوگ جو اس وقت قائدِاعظمؒ کی اس قدر مخالفت کرتے تھے آج کس طرح، زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر، اور ہندوؤں کے ہاتھوں تنگ آ کر اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہو رہے ہیں کہ اقبالؒ اور جناحؒ سچ کہتے تھے۔ (مثلاً) بجنور کے جریدہ، مدینہ کی ۲۸ اگست ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں، مفتی عزیز الرحمٰن صاحب (جو مولانا حسین احمد مدنی مرحوم کے خاص شاگردوں اور ارادت مندوں میں سے ہیں) کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:-

اعترافِ حقیقت

میں آپ کو آج کا نیشنلزم بھی بتلانا چاہتا ہوں کہ وہ ہے کیا؟ اس عقیدہ کا بانی میکیاولی ہے جو اٹلی میں ۱۴۶۹ء میں پیدا ہوا۔ اس عقیدے کی رو سے اسٹیٹ خیرِ اکبر یا خیرِ کل ہے اس کے مقابلہ میں انسان اس کا محکوم اور بندہ ہے۔ اگر کسی انسان کے مذہبی فرائض وطن اور اس کے تقاضوں سے آ کر ٹکراتے ہیں تو قابلِ رد ہیں اور مذہبی فرائض کی آواز بلند کرنے والا انسان وطن دشمن اور باغی ہے۔

اس عقیدے کی اشاعت انگریز نے تحریکِ خلافت کے زمانہ سے شروع کی اور اسلامی ملکوں کو اسلامی رشتہ سے جدا کر کے وطنیت کے نام پر تقسیم کر دیا، کیونکہ انگریز مسلمانوں کی منظم طاقت سے گھبراتا تھا۔ یہی حربہ انگریز نے ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا اور تحریکِ خلافت جو ہندوستان میں مسلمانوں کی خالص اور اعلیٰ سیاسی قیادت تھی اُس کو نیست و نابود کر دیا۔ افسوس کہ ہم انگریز کی چال کو نہ سمجھ سکے جس کی بدولت انگریز کو اور کچھ عرصہ کے لئے ہندوستان میں ٹھکانا مل گیا۔ انگریز خوش تھا کہ اس نے اپنے سب سے بڑے حریف کو شکست دے دی۔

آج اسی عقیدے کا طفیل ہے کہ مسلمان ملکوں کے نام پر تقسیم ہو چکے ہیں۔ آج صدر ناصر محض اسی عقیدے کے سہارے عرب قومیت کو متحد کر رہا ہے۔ اس کو اس سے سروکار نہیں ہے کہ اسلامی رشتہ، عرب قومیت سے زیادہ قوی ہے یا نہیں۔ اس کو اس سے بھی کوئی غرض نہیں ہے کہ مسلمانانِ عالم کس حال میں ہیں۔ ہاں! دنیا میں جو انسان بھی عربیت سے متصف ہے یعنی جغرافیائی اعتبار سے عرب ہے۔ صدر ناصر اس کے لئے سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہیں لیکن جو مسلمان عرب جغرافیائی حدود سے باہر ہے اس کی لاش پر وہ آنسو بہانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

اب رہا ہندوستانی مسلمانوں کا معاملہ، ان بیچاروں کا کیا پوچھتے ہو۔ یہ جہاں ایک طرف مظلوم ہیں وہاں اندھے مقلد بھی ہیں۔

اگر یہ (نیشنلسٹ حضرات) اُس وقت اس حقیقت کو سمجھ لیتے اور قائداعظمؒ کی مخالفت نہ کرتے تو آج پاکستان کا نقشہ بھی کچھ اور ہوتا اور ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کی حالت بھی کچھ اور۔ بلکہ ہمارا خیال ہے کہ اس صورت میں ہندوستان میں کوئی مسلمان پیچھے رہتا ہی نہیں۔ تمام مسلمان ایک آزاد مملکت کے باشندے ہوتے جس کی حدود ان کی آبادی کے لحاظ سے متعین ہوتیں۔ یعنی ملک کی تقسیم تمام مسلمانوں کی تعداد کے تناسب سے ہوتی اور یہ سب اس جدید مملکت کے باشندے ہوتے۔ خیر یہ تو ضمنی بات تھی۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ قائداعظمؒ کی طرف سے یہ مطالبہ پیش ہو رہا تھا اور چاروں طرف سے اس کی اس قدر شدید مخالفت ہو رہی تھی۔ یہ وہ جنگ تھی جس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ — بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن — اس معرکہ میں وہ مردِ مجاہد، اپنے آہنی عزم کے ساتھ چٹان کی طرح کھڑا تھا اور ہر دیدۂ بینا سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ ؎

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا

اب برادرانِ عزیز! آگے بڑھیے اور اس معرکۂ دین و وطن کا دوسرا محاذ دیکھئے۔

ہندو، مسلمانوں سے یہ کہتا تھا کہ جب انگریز یہاں سے چلا جائے گا تو ملک آزاد ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد ہم تمہیں مذہبی آزادی دے دیں گے۔ تم اطمینان اور سکون سے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ۔ ادا کرتے رہنا — اب اور چاہتے کیا ہو، بہشت مل جائے؟ اس کے جواب میں ان سے کہا جاتا کہ مذہب کے متعلق یہ تصور، ہندو دھرم کے سلسلہ میں تو درست ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ مذہب نہیں، دین ہے۔ اور دین کے معنی ہیں طریقِ زندگی۔ نہجِ حیات۔ آئینِ مملکت، دستورِ حکومت۔ مسلمان، دین کے

مذہب اور دین میں فرق

نقطۂ نگاہ سے کبھی آزاد نہیں ہو سکتا جب تک اس کی اپنی آزاد مملکت نہ ہو جس میں یہ دین کو عملی نظام کی حیثیت سے رائج اور متمکن کر سکے۔ جب اسلام کا یہ تصور پیش کیا گیا تو یوں سمجھو گویا کسی نے بھڑوں کے چھتے میں پتھر دے مارا ہو۔ چاروں طرف سے مخالفت کی ایسی یلغار ہوئی کہ تو بہ بھلی۔ یوں نظر آتا تھا گویا یہ لوگ جناحؒ کو نوچ ہی ڈالیں گے۔ ایک طرف سے پنڈت جواہر لال نہرو للکارے۔

> جس چیز کو دین یا منظم مذہب کہتے ہیں اسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے یکسر مٹا دینے تک کی آرزو کی ہے۔ یہ اندھے یقین، ترقی دشمنی، بے دلیل عقیدت اور تعصب اور توہم پرستی کا دوسرا نام ہے۔ (میری کہانی)

دوسری طرف سے گاندھی جی کی آواز آئی کہ:۔

> اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو بالکل الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم میں اس (علیحدگی) کے لئے جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت کو

اس سے کیا واسطہ؛ حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ تمہاری دنیاوی ضروریات کا خیال رکھے۔ مثلاً صحت۔ رسل و رسائل۔ امورِ خارجہ وغیرہ۔ مذہب سے اسے کچھ واسطہ نہیں ـــــ مذہب ہر شخص کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔ (ہریجن مجریہ ۹-۱۲/۴۶)

ادھر ایوانِ اسمبلی سے مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے (جو اس زمانہ میں مرکزی اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے) چلا کر کہا:-

اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جا سکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آ چکا ہے کہ ہم اس کا اعتراف کر لیں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ ضمیر۔ مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام یعنی آسمانوں کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور انہیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تو تصوّر بھی ناممکن ہے کہ اگر مذہب کو سیاسیات سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظامِ حکومت قائم رہ سکتا ہے۔ عصرِ حاضر میں بہترین نظامِ حکومت اس نظریہ پر قائم ہو سکتا ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک قوم بن جائیں۔ (ہندوستان ٹائمز ۵ ۹/۳۸)

بھولا بھائی ڈیسائی نے یہ کہا اور اُدھر سے جناب جوش ملیح آبادی نے مصرعہ اٹھایا اور کہا کہ بجا فرمایا آپ نے ـــــ مذہب ہے ہی ایسی چیز ـــــ عزیزانِ من! میں ان کے الفاظ کو سینہ پر پتھر رکھ کر دہرا رہا ہوں۔ انہوں نے کہا:-

عظیم الشان پیغمبروں کی (معاذاللہ۔ معاذاللہ) حسرتناک تاریخیں اور ان کی پاک زندگی کے حوصلہ شکن حالات ہمارے سامنے ہیں اور ہم سے صاف الفاظ میں کہہ رہے ہیں کہ انسان کی دکھتی ہوئی رگ کا چھیڑنا کس قدر بے نتیجہ اور خطرناک ہوا کرتا ہے۔ مذہب کا بیان یہ ہے کہ خدا نے انبیاء کے ذریعے نوعِ انسان کی اصلاح کرنی چاہی تھی۔ اور اس سلسلہ میں ہزاروں نہیں لاکھوں انبیاء مبعوث فرمائے تھے۔ مگر اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ اس کا جواب مجھ سے نہ طلب فرمایئے۔ عام انسانی حالات و میلانات کو دیکھ کر ذرا اندازہ کر لیجئے کہ انسانیت کا سوادِ اعظم کس راستے پر گامزن ہے۔ (کلیم۔ نومبر ۱۹۳۷ء)

اس سے آپ، برادران! اندازہ لگا لیجئے کہ جس وقت قائدِاعظمؒ نے یہ آواز اٹھائی تھی کہ مسلمان اپنے لئے ایک آزاد مملکت چاہتے ہیں تاکہ اس میں اپنے دین کو ایک عملی نظام کی حیثیت سے اختیار کر سکیں، اس وقت ملک کا ماحول کس قسم کا تھا۔ آج لوگوں کو عام طور پر اتنا ہی معلوم ہے۔ (اس لئے کہ انہیں بتایا ہی یہ جاتا ہے) کہ یہ مہاتما گاندھی اور قائدِاعظمؒ کے مابین لیڈری کی جنگ تھی۔ یا زیادہ سے زیادہ بساطِ سیاست کی مہرہ بازی۔ کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ یہ جنگ درحقیقت کفر اور اسلام کی جنگ تھی، حق باطل کی جنگ تھی۔ شرک اور توحید کی جنگ تھی، جس میں ایک "مغربی وضع" کا مسن رسیدہ۔ نحیف و نزار

مسلمان ایک طرف تھا اور ہندو کی پوری قوم کے علاوہ، (بزعمِ خویش) اسلام کے مدعی سب۔ جمعیت العلماء احرار۔ جماعت اسلامی اور جوش جیسے نیشنلسٹ سب متحدہ محاذ بنائے اس کے بالمقابل کھڑے تھے۔ وہ ان سب سے اپنے یقینِ محکم کی پوری قوت کے ساتھ کہتا تھا کہ:-

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ۔ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا۔

تم دیکھنا کہ حق بالآخر کس طرح غالب آ کر رہتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے ارمغانِ حجاز میں لکھا ہے:-

نگہ دارد برہمن کارِ خود را ۔۔۔ نمی گوید بکس اسرارِ خود را

بمن گوید کہ از تسبیح بگذر ۔۔۔ بدوشِ خود برد زنّارِ خود را

اس میں درحقیقت اس زمانے کی ہندوانہ سیاست کی صحیح صحیح تصویر کھینچی گئی ہے۔ ہندو کی ایک طرف سے یہ کیفیت تھی کہ وہ مسلمان کی زبان سے یہ لفظ بھی نہیں سننا چاہتا تھا کہ مذہب کو سیاست میں کوئی دخل ہے۔ اور دوسری طرف یہ لوگ، انگریز کے چلے جانے کے بعد ہندوستان میں جس معاشرہ کی تشکیل کرنا چاہتے تھے اس کی بنیاد خالص ہندو فلسفہ پر رکھتے تھے۔ چنانچہ اگست ۱۹۳۹ء میں، آل انڈیا کانگریس پارٹی کے جنرل سیکرٹری اچاریہ کرپلانی نے ایک طویل بیان میں بتایا کہ جو لوگ کانگریسی سیاست سے دلچسپی رکھتے ہیں انہیں معلوم ہو جانا چاہیئے کہ یہ مسئلہ صرف سیاست کا نہیں بلکہ ہندو فلسفۂ حیات اور نظریۂ زندگی کا ہے۔

گاندھی فلسفۂ حیات

انہوں نے کہا کہ ہم نے گاندھی جی کی قیادت قبول کی ہے اور:-

گاندھی جی نے کانگرس کو بتایا ہے کہ ہمارا کام صرف یہ نہیں کہ ملک کی سیاسی باگ ڈور انگریز کے ہاتھ سے چھین کر اہلِ ملک کے ہاتھ میں دے دیں۔ بلکہ سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ہم اپنی تمام جدوجہد کی بنیاد کسی ایسے فلسفۂ حیات پر رکھیں جس کے دائرے میں ہماری معاشرت، اخلاق اور روحانیت سب کچھ داخل ہو۔ بالفاظِ دیگر ہماری تحریک کو صرف سیاسی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اسے روحانی اور اعلیٰ فلسفۂ زندگی کے تحت ہونا چاہیئے تاکہ اس جدوجہد سے نہ صرف ہماری سیاسی زندگی متاثر ہو بلکہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ اس سے اثر پذیر ہو اور ہماری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو جسے ہم تاریخ کا نیا دور کہہ سکیں۔ زندگی کا یہی وہ نیا باب اور نیا دور ہے جسے گاندھی جی کانگریس کے ذریعے ہندوستان میں لانے کی سعی کر رہے ہیں۔

ہندو گاندھی

اب ذرا یہ بھی سن لیجئے کہ جن گاندھی جی کے فلسفۂ حیات کو ملک گیر نظام کی حیثیت سے رائج کرنے کا تہیہ کیا جا رہا تھا وہ گاندھی جی کس فلسفۂ حیات کے داعی تھے۔ اس حقیقت کو خود گاندھی جی کے الفاظ ہی میں سنیئے۔ انہوں نے اپنے متعلق فرمایا تھا کہ:-

میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں کیونکہ میں ویدوں، اپ نشدوں، پرانوں اور ہندو دھرم کی

تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں۔ اوتاروں کا قائل ہوں۔ اور تناسخ پر عقیدہ رکھتا ہوں، میں گؤ رکھشا کو اپنے دھرم کا جزو سمجھتا ہوں اور بت پرستی سے انکار نہیں کرتا۔ میرے جسم کا رُواں رُواں ہندو ہے۔ (ینگ انڈیا - ۲۱/۱۰ - ۱۲)

یہ تھے وہ گاندھی جی جن کے متعلق، مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) کا ارشاد تھا کہ:-

گاندھی جی نے جنگِ آزادی میں اپنی جان اور مال دونوں لٹا دیئے۔ پس وہ فی الحقیقت مجاہد فی سبیل اللہ ہیں۔ (مضامین آزاد - ص ۹)

اور انہوں نے پنجاب گڑھ کانگرس کے موقع پر اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا کہ:-

وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا ایک ہی روشن پہلو ہے، جو مہاتما گاندھی کی روحِ عظیم کو جھکنے نہیں دیتا۔

ایک دفعہ شملہ کے ایک جلسہ میں مسٹر سیتامورتی کی تقریر تھی جس کی صدارت مسٹر آصف علی مرحوم کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا:-

ٹیچر کا درجہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ تم کرائسٹ، بدھ، محمدؐ کو بھی ٹیچر کہتے ہو۔ مہاتما گاندھی بھی اسی قسم کے ٹیچر ہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس وقت مسلمان کی ذہنیت کیا بنتی جا رہی تھی؟ اور یہ عقیدہ اس گاندھی کے متعلق

مہاتما گاندھی کا کردار

پھیلایا جا رہا تھا جس کا کیریکٹر یہ تھا کہ ایک دفعہ انہوں نے ملک میں شراب بند کر دینے کی تجویز کی۔ لوگوں نے کہا کہ اسی طرح آپ جُوا اور گھوڑ دوڑ بھی بند کرا دیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ:-

اگر میں جوئے کے خلاف مہم شروع کر دوں تو خطرہ ہے کہ میں ان لوگوں کو ہاتھ سے کھو دوں گا جو میری مستقل طور پر روپے سے مدد کرتے ہیں۔ اگر گھوڑ دوڑ بند کرا دوں تو وائسرائے سے لے کر معمولی آدمی تک میرے خلاف ہو جائیں گے۔ اس طرح میری مہاتمائی ختم ہو جائے گی۔ اور کیا عجب کہ میں اپنے سر کو بھی کھو دوں۔ (ہری جن - اکتوبر ۱۹۳۹ء)

اور سنیئے۔ جب دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی ہے تو مہاتما جی اس زمانے کے وائسرائے (لارڈ لنلتھگو) سے ملے اور اس کا تصور کر کے کہ اس سے لندن کی اہم عمارات کس طرح بمباری سے تباہ ہو جائیں گی وہ رقت میں آ گئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ "اگر انگلستان کو شکست ہو گئی تو ہندوستان کو آزادی حاصل کرنے سے کیا فائدہ ہوگا"۔ اس کے بعد انہوں نے بیان جاری کیا جس میں جنگ کی تائید میں پُرزور الفاظ کہے۔ اس بات کو بمشکل ایک مہینہ گذرا ہوگا کہ کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان جنگ کے معاملہ میں انگریزوں کی مدد نہیں کرے گا جب تک اس کا مطالبۂ آزادی تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ، اس فیصلہ کی تعمیل میں کانگریس کے مرکزی اسمبلی کے ممبروں نے اسمبلی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اب لوگوں کی (اور بالخصوص لارڈ لنلتھگو

ہیں گاندھی جی کی طرف لگ رہی تھیں کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ اور دنیا حیران رہ گئی جب انہوں نے گاندھی جی نے یہ بیان پڑھا کہ میں مجبور ہوں۔ میں تو ایک کی اقلیت ہوں۔ کانگرس ٹھیک کہتی ہے۔ اور اس کے بعد لارڈ لنلتھگو کو مشورہ دیا کہ آپ ہمارا تعاون چاہتے ہیں تو کانگرس کی شرائط منظور کر لیجئے۔ یہ تھے وہ گاندھی جی جنہیں نیشنلسٹ مسلمان (معاذ اللہ) حضرت مسیحؑ اور جناب نبیٔ اکرمؐ کا ہم پایہ رہبر مانتے تھے اور انہیں مجاہد فی سبیل اللہ کہہ کر پکارتے تھے۔

یہ تھی اس وقت مسلمانوں کی ذہنیت جس کے خلاف قائداعظمؒ کو یہ چومکھی لڑائی لڑنی پڑ رہی تھی۔

تمام مذاہب یکساں ہیں

ہندو نے اس حقیقت کو پا لیا تھا کہ مسلمانوں کی اپنے دین کے ساتھ والہانہ وابستگی اس لئے ہے کہ وہ اسے تمام مذاہبِ عالم سے افضل و اعلیٰ سمجھتے ہیں بلکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اب دینِ خالص صرف اسلام ہے۔ اس کے علاوہ باقی مذاہب اس سچائی پر نہیں رہے جو انہیں خدا کی طرف سے ملی تھی۔ اس لئے (ہندو نے) سوچا کہ ہندوستان سے اسلام کو (معاذ اللہ) ختم کرنے کا بہترین طریق یہ ہے کہ ان کی نئی نسل کے دل سے اس خیال کو نکال دیا جائے اور اس کی بجائے انہیں یہ سکھایا جائے کہ تمام مذاہب یکساں طور پر برابر ہیں اور کسی ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ اس سلسلہ میں مہاتما گاندھی کے اس زمانے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر مہادیو ڈیسائی نے کہا کہ :-

ایک جداگانہ قومیت کا تخیل اس خیال سے پیدا ہوتا ہے کہ ہمارا مذہب دوسرے مذاہب پر فوقیت رکھتا ہے۔

(ہری جن - بابت ۲۵ ۱۱/۳۹)

خود مہاتما گاندھی نے کہا کہ :-

میری روح اس بات کے تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندومت مختلف اور متضاد کلچر اور نظریۂ حیات کے حامل ہیں۔ کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کر لینا میرے نزدیک خدا کے انکار کے مرادف ہے کیونکہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کا خدا بھی وہی ہے جو گیتا کا ہے۔

(ہندوستان ٹائمز - مورخہ ۱۴ ۴/۴۰)

وہ اسے انتہائی تنگ نظری پر محمول کرتے تھے کہ یہ کہا جائے کہ مسلمان ایک جداگانہ اور برتر نظریۂ زندگی پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں :-

میں ایک تنگ نظر ہندو یا تنگ نظر اسلام کا تصور نہیں کر سکتا۔ ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے اور ایک بہت بڑی قوم ہے جو مختلف تہذیبوں پر مشتمل ہے اور یہ تہذیبیں ایک دوسری میں جذب ہونی شروع ہو گئی ہیں۔ لیکن مسلم لیگ نے مسلمانوں کو یہ سبق پڑھانا شروع کر دیا ہے کہ یہ تہذیبیں ایک دوسرے میں جذب نہیں ہو سکتیں۔ (ہندوستان ٹائمز۔ مورخہ ۱۵ ۵/۴۳)

آپ نے خیال فرمایا کہ اس خیال سے ہندو کے دل پر کیا گذرتی تھی کہ مسلمانوں کا دین، ہندومت سے الگ اور افضل ہے اور مسلمان ایک جداگانہ تہذیب و تمدن کے علمبردار ہیں۔ مسلمان بچوں کے دل سے اس خیال کو نکالنے کے لئے مہاتما گاندھی نے ایک تعلیمی اسکیم کا منصوبہ بنایا (جسے واردھا کی تعلیمی سکیم کہا جاتا تھا) اس سلسلہ میں انہوں نے کہا :-

یہ سخت خطرناک بات ہے کہ بچوں کو یہ پڑھایا جائے کہ ان کا مذہب باقیوں سے افضل ہے۔ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ اس لئے سب مذاہب برابر ہیں۔

مولانا آزاد کی طرف سے سند

لیکن ظاہر ہے کہ مسلمان، اسلام کے متعلق گاندھی جی کی رائے کو سند ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے تھے اس کے لئے کسی عالم دین کی سند درکار تھی۔ یہ سند مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) کی تفسیر (ترجمان القرآن) سے بآسانی مل گئی جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ :-

عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ قرآن نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔

مولانا آزاد کی تفسیر کے اس حصے کا ہندی میں ترجمہ کیا گیا اور کانگریس کی طرف سے اس کی عام اشاعت کی گئی۔ اس تعلیمی اسکیم کا منصوبہ تو گاندھی جی کی اُپج کا نتیجہ تھا لیکن اسے مرتب کیا ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب نے (جو اب بھارت کے نائب صدر ہیں[1]) یہی وہ حقیقت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ :-

چنیں دَورِ آسماں کم دیدہ باشد ... کہ جبریل امیں را دل خراشد
چہ خوش دیرے بنا کردند آنجا ... پرستد مومن و کافر تراشد!

یہ تعلیمی اسکیم اگر بروئے کار آجاتی تو اس کے نتائج جس قدر خطرناک ہو سکتے تھے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ فللہ الحمد کہ ہندو کا یہ منصوبہ بھی پروان نہ چڑھ سکا اور انہیں اس تعلیمی اسکیم کے مطابق تیار کردہ کتابیں، بمبئی کے ساحل سے سمندر کی نذر کرنی پڑیں۔ (اس میں طلوع اسلام کی جد و جہد کا کتنا بڑا حصہ تھا، اس کا تذکرہ ضروری نہیں۔)

مسٹر ساورکر

یہ تو تھے وہاں کے کانگریسی لیڈروں کے عزائم اور ارادے۔ دوسرے لیڈر اس مخالفت میں ان سے بھی بڑھ کر تھے۔ یا یوں کہئے کہ کانگریسی لیڈر جو کچھ اپنے سینوں میں چھپائے رکھتے تھے، دوسرے لیڈر انہیں برملا اُگل دیتے تھے۔ مثلاً ہندو مہاسبھا کے پریذیڈنٹ،

[1] اور اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ (۱۹۷۷ء)

مسٹر ساورکر کہتے تھے کہ :-

لفظ ہندو سے عبارت ہے ہر وہ شے جو ہندوستان کی ہو۔ مثلاً کلچر۔ نسل اور روایات۔ اور ہندو کے معنی ہیں ہر وہ شخص جو ہندوستان کا رہنے والا ہو اور جس کے آباء و اجداد یہاں کے باشندے ہوں۔ (ہندوستان ٹائمز۔ ۲۰ $\frac{۲}{۳۹}$)

یعنی انہوں نے (بزعم خویش) فیصلہ کر لیا تھا کہ ہندوستان میں رہنے والے مسلمان ہندو ہی ہیں۔ ہندو مہاسبھا کے نائب صدر ڈاکٹر رادھا مکرجی نے آل انڈیا ہندو ویدک یوتھ کانفرنس (لاہور) کی صدارت کرتے ہوئے کہا۔

ہندوستان کو نظری اور عملی طور پر ایک ہندو اسٹیٹ ہونا چاہیئے جس کا کلچر ہندو اور جس کا مذہب ہندو ازم ہو۔ اور جس کی حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہو۔

اس اسٹیٹ میں مسلم اقلیت کی کیا حالت ہو گی، اس کے متعلق آپ پنڈت جواہر لال نہرو کا وہ بیان پہلے سُن چکے ہیں جس میں انہوں نے کہا تھا کہ :-

جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت، اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھتی ہے۔

اور اس جواہر لعل نہرو کے متعلق مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کا ارشاد تھا کہ :-

جواہر لعل ہندو ہے۔ اس نے کبھی نہیں کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ اس کے باوجود وہ مسلمانوں کی حفاظت چاہتا ہے۔

یہ تھا برادرانِ عزیز! وہ ماحول جس میں قائدِ اعظمؒ محمد علی جناحؒ، گھرا ہوا اکیلا کھڑا تھا ـــــ اس طرح اکیلا جس طرح سمندر کی تلاطم انگیز موجوں میں روشنی کا مینار کھڑا ہوا۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں (با دستے تصرف) ؎

ہوا تھی گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا تھا
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے تھے اندازِ خسروانہ

نظریۂ پاکستان کی مخالفت

ان حالات میں اس مردِ آہن گداز نے پاکستان کا مطالبہ پیش کیا اور اس پر انتہائی ثبات و استحکام سے کھڑا رہا۔ پاکستان کا مطالبہ اسلام کے نام پر کیا گیا تھا کہ اس سے مقصود ہی ایک ایسی آزاد مملکت کا حصول تھا جس میں اسلام کو ایک زندہ نظامِ حیات کی حیثیت سے متمکن کیا جا سکے۔ پاکستان کے مطالبہ کا رزولیشن مارچ ۱۹۴۰ء میں پاس ہوا۔ اور شروع اپریل ۱۹۴۰ء میں مہاتما گاندھی نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا :-

میں پوری جرأت اور جسارت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مسٹر جناحؒ اور ان کے ہم خیال حضرات اپنی اس روش سے اسلام کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہے بلکہ وہ اس پیغام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں جو لفظ اسلام کے اندر پوشیدہ ہے۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت اس لئے

پیش آئی کہ آجکل مسلم لیگ کی طرف سے جو کچھ ہو رہا ہے اس سے میرے دل پر سخت ٹھیس لگ رہی ہے - میں اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں کوتاہی کروں گا ۔ اگر میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اس دروغ بافی سے متنبہ نہ کردوں جس کا اس نازک وقت میں ان میں پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے -

(ہندوستان ٹائمز - ۲/۴ ۷)

یہ تھا گاندھی جی کا فتویٰ (کہ قائداعظمؒ اور ان کے رفقاء اسلام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں) انہی کے ساتھ وہ مسلمان بھی شامل تھے جو اپنے آپ کو نیشنلسٹ کہتے تھے - مثلاً :-

مسلمانوں کی طرف سے مخالفت

سندھ کے خان بہادر اللہ بخش نے پاکستان کی تجویز کے متعلق کہا :-

یہ اسکیم آزادیٔ ہند کے راستے میں روڑے اٹکاتی ہے -

عبدالرحمٰن سرحدی صاحب نے فرمایا :-

یہ ہندوستان میں برطانوی تسلط قائم رکھنے کا ذریعہ ہے -

مولانا حفیظ الرحمٰن سیوہاروی (مرحوم) نے کہا کہ :-

یہ برطانوی حکومت قائم رکھے گی -

احراری لیڈر مولانا حبیب الرحمٰن لودھیانوی (مرحوم) نے فرمایا :-

یہ اسکیم ملک کے مفاد کے لئے بالعموم اور مسلمانوں کے مفاد کے لئے بالخصوص نقصان رساں ہے - اگر کبھی اسلامستان وجود میں آیا تو احرار کے ہاتھوں آئے گا -

مودودی صاحب نے اس تحریک کی کس شدت سے مخالفت کی تھی اس کے متعلق ہم اکثر لکھتے چلے آرہے ہیں اس لئے اسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں -

بظاہر "اپنوں" کی طرف سے

یہ لوگ تو پھر بھی تحریک پاکستان کے کھلے ہوئے مخالف تھے - قیامت تو یہ تھی کہ خود موافقین میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جو اس مطالبہ کی مخالفت میں ان لوگوں سے پیچھے نہ تھے - تحریکوں کو جس قدر نقصان منافقین کے ہاتھوں سے پہنچا ہے کھلے مخالف اتنا نقصان کبھی نہیں پہنچا سکے - اس زمانے میں پنجاب میں سرسکندر حیات خاں وزیراعظم تھے - اور بنگال میں مولوی فضل الحق صاحب - سرسکندر کی یہ کیفیت تھی کہ عین اس زمانے میں جب پاکستان کا ریزولیشن پاس ہوا ہے وہ اسلامیہ کالج کے طلباء کو یہ تاکید کر رہے تھے کہ :-

زندگی میں تمہارا نصب العین کچھ ہی ہو لیکن یاد رکھو تم کسی ایسی اسکیم کی تائید نہ کرنا جس کا منشاء ہندوستان کو تقسیم کرکے مسلمانوں کے لئے الگ خطہ منتخب کرنا ہو - یہ اسلام کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہوگا -

ان کے دست راست سرچھوٹو رام نے کہا کہ :-

سرسکندر کسی خالص اسلامی حکومت میں وزیراعظم تو ایک طرف کوئی ذمہ داری کا عہدہ لینے کے لئے

تیار نہیں ہوں گے۔ پنجاب میں صرف پنجابیوں کی حکومت ہوگی۔

دوسری طرف سے مولوی فضل الحق بولے کہ:

ہم سے پوچھا جاتا ہے کہ تم نے جناحؒ کی مدد کیوں نہیں کی۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ ہم نے کبھی ایسے شخص کو لیڈر نہیں مانا جو غیر بنگالی ہو۔

جناحؒ اپنوں اور بیگانوں کی ان بھانت بھانت کی بولیوں کی سنتا تھا اور دل کے پورے سکون اور اطمینان سے اپنے مخصوص تبسم کے ساتھ کہتا تھا کہ: ؎

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اکثر
مجھے کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا

چنانچہ ان تمام اعتراضات اور ہفوات کے جواب میں، انہوں نے یکم مارچ ۱۹۴۱ء کو، مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے لاہور کے سیشن میں اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا۔

لاہور کے پلیٹ فارم ہی سے مسلم لیگ نے پاکستان کا مطالبہ پیش کیا اور آج میں اسی پلیٹ فارم سے اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان ایک ایسی منزل ہے جس تک پہنچنے سے مسلمانوں کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ ہندوستان کے تراعظم میں پاکستان کے سوا اور کوئی دستور کامیاب نہیں ہو سکتا۔ پاکستان بن کر رہے گا..... میں تو یہ کہونگا کہ یہ بن چکا ہے۔

اللہ اکبر! کس قدر یقینِ محکم تھا اس آہنی عزم والے انسان کو اپنے مطالبہ کی صداقت پر۔ اسی یقینِ محکم اور عزمِ راسخ کا نتیجہ تھا کہ آہستہ آہستہ شدید ترین مخالفین نے بھی اس مطالبہ کی تائید کرنی شروع کر دی۔ (مثلاً) مسٹر این۔ سی۔ دت (جو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے رکن تھے) انہوں نے فروری ۱۹۴۰ء میں اپنی ایک کھلی چٹھی میں (جو اخبار مدینہ بجنور کی یکم فروری کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی) لکھا۔

اعترافِ حقیقت

ان حالات میں میرا خیال ہے کہ ہندو مسلم قضیہ کا حل یہی ہوگا کہ ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کو دو قومیں سمجھ لیا جائے اور پھر دو قوموں کی حیثیت سے ان سے متعلق ایک متحدہ قومیت کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا جائے مسٹر جناحؒ نے حال ہی میں گاندھی جی کو جواب دیتے ہوئے متحدہ قومیت کے تصور کو سراب کے لفظ سے تعبیر کرکے اس خیال کا اظہار کیا ہے۔ وہ میرے خیال میں اب نہیں تو کل حقیقت ہو کر رہے گا۔ بہرحال اگر یہ چیز بھی جلد طے ہو جائے تو کچھ بُرا نہیں۔ یوگوسلاویہ کے کروٹ اور سراب کی طرح، اگر ہندوستان کے ہندو، اور مسلمانوں میں بھی بحیثیت فرقہ کے نہیں، بلکہ بحیثیت دو قوموں کے سمجھوتہ ہو جائے اور مسلم اکثریت کے علاقوں میں ہندو اکثریت کے علاقے مداخلت نہ کریں۔ اور ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمان مداخلت نہ کریں۔ تب بھی ہندوستان کا اجتماعی مفاد محفوظ رہ سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں پاکستان کے خیال سے ڈرنا نہیں چاہیئے۔ البتہ اس میں مناسب ترمیم و اصلاح کر کے

اُسے اپنے حسبِ حال بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ (مدینہ۔ یکم فروری ۱۹۳۷ء)

حتیٰ کہ لالہ لاجپت رائے جیسے کٹر ہندو اور نظریۂ پاکستان کے سخت ترین مخالف نے مسٹر سی۔ آر۔ داس کو ایک خط میں (جو اخبار مرہٹہ کی ۲ر فروری ۱۹۲۴ء کی اشاعت میں چھپا تھا) لکھا:

ایک اور چیز جو کچھ عرصہ سے میرے لئے بے حد وجہ اضطراب ہو رہی ہے، وہ ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اس پر دعوتِ غور و خوض دوں۔ گذشتہ چھ ماہ میں، میں نے اپنے وقت کا بیشتر حصّہ اسلامی تاریخ اور اسلامی قوانین کے مطالعہ میں صرف کیا ہے اور اس سے جس نتیجہ پر میں پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ چیز (یعنی ہندو مسلم اتحاد) ایک امرِ محال اور ناقابلِ عمل شے ہے۔ وہ مسلمان رہنما جو عدمِ تعاون کی تحریک میں شامل ہیں اگر اُن کے خلوصِ نیت کو تسلیم بھی کر لیا جائے پھر بھی میرے خیال میں ان کا مذہب اس چیز (ہندو مسلم اتحاد) کے راستے میں ایک زبردست رکاوٹ ثابت ہوگا۔

آپ کو یاد ہوگا، کہ میں نے کلکتہ میں اپنی اس گفتگو کا جو اس باب میں حکیم اجمل خان صاحب اور ڈاکٹر کچلو سے ہوئی تھی، آپ سے تذکرہ کیا تھا۔ ہندوستان میں حکیم صاحب سے زیادہ سُلجھا ہوا کوئی مسلمان نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا حکیم صاحب یا کوئی دوسرا مسلمان رہنما قرآن کی تعلیم کے احکامات پر خطِ تنسیخ کھینچ سکتا ہے! خدا کرے کہ اسلامی قوانین کے مطالعہ کے بعد جس نتیجہ پر میں پہنچا ہوں وہ غلط ہو کیونکہ میرے دل کی کھٹک کو دور کرنے کے لئے اس سے زیادہ عمدہ بات کوئی نہ ہوگی۔ لیکن اگر میرا خیال صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم (ہندو اور مسلمان) انگریز کے مقابلہ کے لئے متحد ہو سکتے ہیں۔ لیکن برطانوی طرزِ حکومت کے مطابق ہندوستان میں نظامِ حکومت قائم کرنے کے لئے ایسا اتحاد ناممکن نظر آتا ہے۔ اس کا دوسرے لفظوں میں یہ مطلب ہوگا کہ ہم ہندوستان میں جمہوری طرزِ حکومت قائم نہیں کر سکتے تو پھر اس کا علاج کیا ہے؟ میں ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں سے خائف نہیں ہوں۔ لیکن ہم ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں اور ان کے ساتھ افغانستان وسط ایشیا، عرب، عراق اور ترکی کے مسلح لشکروں کی تاب نہ لا سکیں گے۔ میں تہ دل سے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت کا قائل ہوں۔ اس کے لئے میں مسلمان راہ نماؤں پر اعتماد کرنے کو بھی تیار ہوں۔ لیکن قرآن و حدیث کے احکام کو ہم کیا کریں گے؟ مسلمان راہ نما ان پر تو خطِ تنسیخ نہیں کھینچ سکتے۔ تو پھر کیا ہماری یہ تباہی، قضاء مبرم ہے؟ امید ہے کہ ایسا نہ ہوگا۔ اور آپ کا ذہنِ رسا اور قلبِ بصیر اس مشکل کا کوئی حل تجویز کر سکے گا۔

چنانچہ اس طرح رفتہ رفتہ فضا ہموار ہوتی چلی گئی۔ اس آہنی عزم والے انسان کے سامنے، مخالفت کے پورے ہجوم کو جھکنا پڑا اور زمانے کو اپنا دھارا اس کی منشاء کے مطابق بدلنا پڑا۔ اور ہندو۔ انگریز اور خود مسلمان کے اس جمِ غفیر کی مخالفت کے علی الرغم، ۱۹۴۷ء میں پاکستان وجود میں آ گیا۔ "کامیاب زندگی" کا

جو معیار ہم نے شروع میں پیش کیا تھا۔ آپ اسے سامنے لائیے اور دیکھئے کہ اس زمانے میں اس مردِ مجاہد کی زندگی سے زیادہ کامیاب زندگی کسی اور کی بھی کہلا سکتی ہے؟ اس کے شعور نے

پاکستان بن گیا

جب آنکھ کھولی تو پورے ماحول کو اپنے مقصد کے خلاف پایا۔ اور جب اس نے اپنی طبیعی آنکھ بند کی تو سارا ماحول اس کی منشاء کے قالب میں ڈھلا ہوا تھا۔ قابلِ صد رشک ہے ایسی زندگی اور درخورِ ہزار تبریک و تہنیت ہے ایسی موت۔

مرگے کہ زندگانی باو آرزو کند

یہ زندگی وہ ہے جس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

یہ زندگی، کوہکن کی زندگی سے بھی زیادہ کامیاب ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکا۔ اس نے خانہ شگافی ضرور کی تھی لیکن جوئے شیر نہیں لا سکا تھا۔ اور یہ کوہ کنی ہے کہ جس کی جوئے شیر، پہاڑ سے، آپ کے، اور آنے والی نسلوں تک کے لئے زندگی اور شادابی کا سرچشمہ ہے۔ یہ وہ کوہکن تھا جس کی بارگاہ میں دنیا بھر کے زعماء، مفکرین اور اربابِ سیاست نے گلہائے عقیدت پیش کئے۔

خراجِ تحسین

مثلاً:۔

یورپ کے نامور اخبار۔ لنڈن ٹائمز نے لکھا:۔

قائدِاعظمؒ نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ پیش کر کے اپنے اس دعوے کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان میں وہ ذہنی لچک نہیں جو انگریز کے نزدیک ہندوستانیوں کا خاصہ ہے۔ ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت۔ واضح اور شفاف ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہ تھی بلکہ وہ جس نقطۂ نظر کو اپنا ہدف بناتے تھے اس پر براہِ راست نشانہ باندھ کر وار کرتے تھے۔ وہ ایک ناقابلِ تسخیر حریف تھے۔

بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو نے ان کی عظمت پر نذرِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا:۔

وہ زندگی کے حقائق کو جانچنے۔ پرکھنے اور تسلیم کرنے میں بڑے محتاط اور غیر جانبدار۔ معاملات میں سوجھ بوجھ اور سلامت روی کے مظہر۔ مگر حقیقی مقصد کے لئے ناقابلِ شکست چٹان تھے۔

امریکہ کے سابق صدر، مسٹر ٹرومین نے کہا:۔

دولتِ پاکستان کا معمار۔ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کا بانی، مجھے یقین ہے کہ مسٹر جناحؒ کی غیر معمولی قیادت کی یاد، حکومتِ پاکستان اور اس کے عوام کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔

اور اس وقت کے مملکتِ ایران کے سفیر، آقائے علی اصغر حکمت نے خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا:۔

ایسے عظیم الشان انسان آسمان کے ان ستاروں کی طرح ہیں جن کی روشنی ہم تک بعید از قیاس فاصلے طے کر کے پہنچتی ہے۔ اور اگرچہ وہ انسانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں لیکن ان کے نور سے ہمیشہ کسبِ فیض کیا جا سکتا ہے۔ قائداعظمؒ کی شخصیت آئندہ نسلوں کے لئے مینارۂ نور کا کام دے گی۔

یہ ہے برادرانِ عزیز! وہ زندگی جس کی کامیابی کی شہادت دنیا اس طرح دے رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ افراد آتے ہیں اور جاتے ہیں۔ واقعات رونما ہوتے ہیں اور مٹ جاتے ہیں۔ وقت کے دریا کا بہاؤ آگے چلا جاتا ہے وہ واپس نہیں آتا۔ یہ سب آنی اور فانی ہوتے ہیں۔ لیکن سے

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ او!

اور اسی کو کہتے ہیں برادرانِ عزیز! کامیاب زندگی۔ والسلام

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

لاہور میں ہر اتوار ۹ بجے صبح (فون ۸۰۸۰۰) ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)	**لیہ** میں ہر جمعہ بعد نماز مغرب۔ کیپٹن غلام حیدر خاں کے مکان (نمبر ۳۵۱ وارڈ نمبر ۱) واقع عقب گلی گرلز ہائی اسکول (بذریعہ ٹیپ)
ملتان میں ہر جمعہ ۳½ بجے سہ پہر (بذریعہ ٹیپ) (فون ۲۰۷۱) دفتر شاہ سنز۔ بیرون پاک گیٹ	**کراچی** میں ہر اتوار ۹½ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) (فون ۶۱۰۴۹۸) دفتر بزم طلوعِ اسلام۔ دار القائد ۲۰-۱/بی۔ ناظم آباد ۳
جام پور میں ہر جمعہ بعد نماز عشاء (بذریعہ ٹیپ) (ڈیرہ غازی خاں) بلوچ جنرل اسٹورز۔ اڈہ روڈ۔	**لائلپور** میں ہر جمعہ ۸½ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) (فون ۲۴۹۴) ۶۵ کوتوالی روڈ حیات سرجری کلینک
گجرات میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز بروز اتوار ۴ بجے شام بمقام ۱۲/۱/بی۔ بھمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)	**راولپنڈی** میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) جی۔ ۱۶۶ لیاقت روڈ۔
جلالپور جٹاں میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) (گجرات) دفتر بزم طلوعِ اسلام (بازار کلاں)	**کوئٹہ** میں ہر جمعہ ۳½ بجے سہ پہر (بذریعہ ٹیپ) مکان نمبر ۱۹/۱۷-۴ عبدالستار روڈ (نزد گرین ہوٹل)

حقائق و عبر

۱۔ "مسیحِ موعود" قادیانی کی اُمت

پرویز صاحب اکثر کہا کرتے ہیں (اور اسے انہوں نے اپنی کتاب، ختم نبوت اور تحریکِ احمدیت میں بھی لکھا ہے۔) کہ "احمدی" حضرات ان کے سامنے چند منٹ تک بھی ٹھہر نہیں سکتے کیونکہ وہ روایات میں اُلجھے بغیر قرآنی اسناد کی رو سے بات کرتے ہیں، اور اس کا ان لوگوں کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ ان کی بحث کا سارا مدار (وضعی) روایات یا صوفیاء وغیرہ کے اقوال پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہاولنگر کا مشہور مقدمہ قریب نو سال تک بھنور میں گھری ہوئی لکڑی کی طرح ایک ہی مقام پر گھومتا رہا اور کسی فیصلہ کن ساحل تک نہ پہنچ سکا۔ لیکن جب ان کا (پرویز صاحب کا) ایک مقالہ سامنے آیا تو جج نے فیصلہ دیدیا کہ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ جو شخص مرزائی ہو جاتا ہے، وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ اس کے بعد پرویز صاحب مسئلہ ختم نبوت پر اپنے اسی مخصوص انداز سے لکھتے رہے تا آنکہ ستمبر ۱۹۷۴ء میں آئینی طور پر فیصلہ ہوگیا کہ مرزا غلام احمد کے متبعین غیر مسلم ہیں۔ اس فیصلہ کا "احمدیوں" کی لاہوری جماعت پر خاص طور پر بہت بُرا اثر پڑا۔ کیونکہ وہ دنیا جہان سے کٹ کر الگ ہو گئے۔ وہ اُمتِ محمدیہ سے بھی علیحدہ ہو گئے اور انہیں غیر مسلم اہلِ ربوہ نے بھی اپنے ساتھ نہ ملایا۔ چونکہ اس فیصلہ کی بنیاد وہ قرآنی دلائل تھے جو پرویز صاحب پیش کرتے چلے آ رہے تھے اس لئے انہیں (لاہوری جماعت کو) سب سے زیادہ غصہ پرویز صاحب پر ہے۔ چنانچہ وہ گذشتہ دو اڑھائی سال سے ان کے خلاف مسلسل لکھتے چلے آ رہے ہیں ـــــ ان کا ایک ایک مقالہ پندرہ پندرہ، بیس بیس قسطوں میں چھپتا ہے اور اس کے بعد اسے کتابی شکل میں بھی شائع کیا جاتا ہے۔ یہ مقالات کس قدر جھوٹے پراپیگنڈہ پر مشتمل ہوتے ہیں اس کا اندازہ ایک حالیہ مضمون سے لگائیے، جو پیغامِ صلح بابت ۲۲ فروری ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا ہے۔ مقالہ کا عنوان ہے "وحی اور تصوف پر پرویزی نظریات کی حقیقت" اور مقالہ نگار ہیں۔ "جناب مولوی احمد گل صاحب، فاضل دیوبند" اس میں انہوں نے تحریر فرمایا ہے کہ پرویز صاحب کا عقیدہ یہ ہے کہ:-

> اطاعتِ رسولؐ سے مراد یہ ہے کہ خلیفۃ الرسول یا سربراہِ مملکت کے فیصلوں کی اطاعت کی جائے۔" اطاعت صرف خدا کی ہو سکتی ہے۔ حتیٰ کہ رسولؐ بھی اپنی اطاعت کسی سے نہیں کرا سکتا۔ آنحضرتؐ کی اطاعت آپؐ کی زندگی تک محض مرکزِ ملت ہونے کی وجہ سے تھی۔ آج مرکزِ ملت کی عدم موجودگی میں آنحضرتؐ کے احکام کی پابندی غیر ضروری ہے۔"
>
> (سلیم کے نام ۔ جلد ۳ ۔ صـ ۲۸۲)

"سلیم کے نام خطوط" کی محولہ بالا جلد اگست ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی تھی اور اس کے نسخے سینکڑوں گھروں اور کتب خانوں میں موجود ہیں۔ آپ اس جلد کو اٹھایئے اور دیکھئے کہ اس کے صفحہ ۲۸۲ پر کہیں یہ الفاظ موجود ہیں کہ :-

آج مرکزِ ملت کی عدم موجودگی میں آنحضرتؐ کے احکام کی پابندی غیر ضروری ہے۔

اُس صفحہ پر نہیں۔ ہم مقالہ نگار اور مدیر پیغام صلح سے پوچھتے ہیں کہ کیا اس پوری کتاب میں یہ الفاظ کہیں موجود ہیں۔ اس سے بھی آگے بڑھئے۔ یہ کتاب (سلیم کے نام خطوط) تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ کیا ان تین جلدوں میں کسی جگہ بھی یہ الفاظ ملتے ہیں؟ اور اس سے بھی ایک قدم آگے۔ پرویز صاحب کی قریب تین درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں بعض کتابیں ڈیڑھ ڈیڑھ، دو دو ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔ کیا ان کتابوں میں کسی جگہ بھی یہ الفاظ ملتے ہیں؟ پرویز صاحب کے مقالات، طلوع اسلام میں مسلسل شائع ہوتے ہیں اور طلوع اسلام پاکستان میں ۱۹۴۸ء سے جاری ہے۔ کیا اس میں کسی ایک جگہ بھی پرویز صاحب کے یہ الفاظ نظر آتے ہیں؟ اس کے برعکس، پرویز صاحب نے اپنی اس کتاب (سلیم کے نام۔ جلد دوم) کے صفحہ ۱۹ پر کہا ہے کہ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم پھر اسی خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کو قائم کریں جسے مرکزِ ملت کہا جاتا ہے۔

جب تک خلافت کا یہ سلسلہ قائم نہیں ہو جاتا کسی فرد کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ اُمت کے امورِ شریعت (نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ وغیرہ کی جزئیات) جس طریق پر چلی آ رہی ہیں اس میں کوئی تغیر و تبدل کرے۔

یہ بات ان کی صرف اسی کتاب میں نہیں کہی گئی۔ جہاں جہاں بھی انہوں نے اس موضوع سے بحث کی ہے، انہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ان احکامِ شریعت پر اسی طور سے عمل کرنا ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ احکامِ شریعت، رسول اللہؐ ہی کے متعین فرمودہ ہیں (یا حضورؐ کی طرف منسوب ہیں)

یہ ہے پرویز صاحب کا مسلک، اور وہ ہے وہ الزام جو پیغامِ صلح ان کے خلاف یہ کہہ کر عائد کرتا ہے کہ ان کا مسلک یہ ہے کہ "آج مرکزِ ملت کی عدم موجودگی میں آنحضرتؐ کے احکام کی پابندی غیر ضروری ہے"۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ یہ حضرات جھوٹے پروپیگنڈہ میں کس حد تک جا سکتے ہیں۔

ہم نے لاہوری جماعت سے دو سوال پوچھے تھے۔ انہوں نے اس دو اڑھائی سال کے عرصہ میں، جھوٹے پراپیگنڈہ میں تو اتنے ورق سیاہ کر ڈالے، لیکن ان مختصر سے سوالات کے متعلق ایک لفظ تک نہیں لکھا۔ ہم ان سوالات کو طلوعِ اسلام بابت اپریل ۱۹۷۵ء سے دوبارہ درج کرتے ہیں۔

لاہوری احمدیوں سے صرف دو سوال پوچھئے

پہلا سوال :- ان سے کہئے کہ آپ کہتے ہیں کہ مرزا صاحب کا دعویٰ صرف مسیحِ موعود ہونے کا تھا اور یہ دعویٰ ایسا نہیں جس کے نہ ماننے سے کفر لازم آ جاتا ہو۔ لیکن مرزا صاحب نے اس باب میں یہ کہا ہے :-

کفر دو قسم پر ہے۔ ایک کفر یہ ہے کہ ایک شخص اسلام ہی سے انکار کرتا ہے اور آنحضرتؐ کو رسول نہیں مانتا۔ دوسرے یہ کفر کہ مثلاً وہ مسیح موعود کو نہیں مانتا۔ اور اس کو باوجود اتمامِ حجت کے

جھٹلا جاتا ہے۔ جس کے ماننے اور سچا جاننے کے بارے میں خدا اور رسولؐ نے تاکید کی ہے، اور پہلے نبیوں کی کتابوں میں بھی تاکید پائی جاتی ہے۔ پس اس لئے کہ وہ خدا اور رسولؐ کے فرمان کا منکر ہے، کافر ہے۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ دونوں قسم کے کفر ایک ہی قسم میں داخل ہیں۔ (حقیقۃ الوحی ۔ صفحہ ۱۷۹)

ان سے پوچھئے کہ جو لوگ مرزا صاحب کو مسیح موعود نہیں مانتے وہ مرزا صاحب کے قول کے مطابق، کافر قرار پاتے ہیں یا نہیں؟

دوسرا سوال:۔ ان سے یہ پوچھئے کہ جہاد بالسیف (یعنی تلوار سے مخالفین کے خلاف جنگ کرنا) قرآن مجید کا حکم ہے اور مرزا صاحب نے کہا تھا کہ:۔

آج سے انسانی جہاد (جو تلوار سے کیا جاتا تھا) خدا کے حکم سے بند کیا گیا۔ اب اس کے بعد جو شخص کافر پر تلوار اٹھاتا اور اپنا نام غازی رکھتا ہے، وہ اس رسول کریمؐ کی نافرمانی کرتا ہے جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے فرمایا کہ مسیح موعود کے آنے پر تمام تلوار کے جہاد ختم ہو جائیں گے۔ سو اب میرے ظہور کے بعد تلوار کا کوئی جہاد نہیں۔ (اربعین ۴ ۔ صفحہ ۴۷)

حتیٰ کہ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ ــــــ دیں کے لئے حرام ہے اب جنگ اور قتال۔

ان سے پوچھئے کہ جو شخص قرآن کریم کے ایسے اہم حکم کو منسوخ اور حرام قرار دینے کا دعویٰ کرتا ہے وہ مسلمان کہلا سکتا ہے؟ اگر وہ کسی لفظی الٹ پھیر سے کام لیں، تو ان سے کہئیے کہ اس باب میں خود مرزا صاحب نے فیصلہ دے رکھا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:۔

ہم پختہ یقین کے ساتھ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ قرآن شریف خاتم کتب سماوی ہے اور ایک شعشہ یا نقطہ اس کی شرائع اور حدود اور احکام اور اوامر سے زیادہ نہیں ہو سکتا نہ کم ہو سکتا ہے۔ اور اب کوئی ایسی وحی یا الہام منجانب اللہ نہیں ہو سکتا جو احکامِ فرقانی کی ترمیم و تنسیخ یا کسی ایک حکم کی تبدیلی یا تغیر کر سکتا ہو۔ اور اگر کوئی ایسا خیال کرے تو وہ ہمارے نزدیک جماعتِ مومنین سے خارج اور ملحد اور کافر ہے۔

(ازالۂ اوہام ۔ صفحہ ۱۳۸ ۔ بحوالہ پیغام صلح ۔ بابت ۵ مارچ ۱۹۴۳ء)

ان سے پوچھئے کہ مرزا صاحب کے اپنے فیصلہ کے مطابق، وہ "جماعتِ مومنین سے خارج اور ملحد اور کافر" قرار پاتے ہیں یا نہیں ــــــ اور جو، اس کے باوجود، انہیں (مرزا صاحب) کو مسلمان سمجھے وہ بھی ویسا ہی قرار پاتا ہے یا نہیں؟

ان سے ان دو سوالات کے دو ٹوک جواب مانگئے۔ اور ادہر ادھر بالکل نہ ہونے دیجئے۔

۲۔ قائدِ اعظمؒ کے سوانح حیات اور مغربی مصنّفین

جیسا کہ متعدد بار (بصد تاسف) لکھا جا چکا ہے، ہم ابھی تک قائدِ اعظمؒ کی کوئی مستند سوانح عمری مرتب

نہیں کر سکے اور ہمارا بیشتر انحصار مغربی مصنفین کی کتابوں پر ہوتا ہے۔ ان مصنفین کے بیانات کس حد تک قابلِ اعتماد ہوتے ہیں، اس کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے لگائیے۔

پچھلے سال (FREEDOM AT MIDNIGHT) کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی تھی، جس نے بڑی شہرت حاصل کر لی تھی، بالخصوص اس لئے کہ اس میں لارڈ مونٹ بیٹن کے بیان کردہ کچھ واقعات بھی تھے۔ اس کتاب میں قائدِاعظمؒ کی صاحبزادی — مسز ڈینا واڈیا — کا ایک انٹرویو بھی تھا جس میں دکھایا گیا تھا کہ انہوں نے اپنے والد مرحوم کے متعلق بہت سے واقعات اور اپنے تاثرات بیان کئے تھے۔ شروع فروری ۱۹۷۶ء میں روزنامہ ڈان (کراچی) کے میگزین ایڈیشن میں خالد علی صاحب کے قلم سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے اپنا وہ انٹرویو درج کیا ہے جو انہوں نے محترمہ مسز واڈیا سے لیا ہے۔ اس انٹرویو میں مسز واڈیا نے کہا ہے کہ اس کتاب میں قائدِاعظمؒ کا جو نقش پیش کیا گیا ہے وہ بڑا متعصبانہ اور غلط مفروضات پر مبنی ہے۔ انہوں نے کہا:-

> کتاب کے مصنفوں نے کہا ہے کہ قائدِاعظمؒ کے متعلق انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ میرے انٹرویو اور میری فراہم کردہ معلومات پر مبنی ہے۔ یہ دونوں دعوے جھوٹے ہیں۔ نہ میں نے ان لوگوں کو کوئی انٹرویو دیا اور نہ ہی والد مرحوم کے متعلق کوئی معلومات فراہم کیں۔ مجھے اتنا یاد پڑتا ہے کہ ایک شام مسٹر (D. LAPIERRE) ہوٹل میں میرے کمرے میں آ گئے۔ میں نے ان سے صاف کہہ دیا کہ اوّل تو میں کسی کو انٹرویو دیا ہی نہیں کرتی، دوسرے اس وقت میں باہر کھانے پر جا رہی ہوں۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے چند منٹ کے لئے باتیں کرنے پر اصرار کیا۔ وہ بمشکل دس منٹ میرے کمرے میں رہے اور ان میں سے بھی نصف وقت اسی بحث و تمحیص میں صرف ہو گیا کہ میں انٹرویو نہیں دیا کرتی۔ اس وقت میرے کمرے میں ایک اور مہمان بھی موجود تھے اور مسٹر (LAPIERRE) سے میری باتیں بالکل عام نوعیت کی تھیں۔ اسے نہ تو انٹرویو کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی قائدِاعظمؒ کے کوائفِ حیات کے متعلق معلومات کی فراہمی۔ اس کے باوجود، اس کتاب کے مصنفین نے یہ افسانہ وضع کر دیا کہ یہ معلومات میری فراہم کردہ ہیں۔
>
> اس کتاب کے مصنفین نے یہ بھی لکھا ہے کہ میں بمبئی کے مضافات میں کولابا میں رہا کرتی تھی۔ کولابا نہ تو بمبئی کے مضافات میں ہے اور نہ ہی میں کبھی وہاں رہی ہوں۔ اس سے آپ اس کتاب میں پیش کردہ "واقعات" کے قابلِ اعتماد ہونے کا اندازہ لگا لیجئے۔

اور یہ ہیں وہ کتابیں جنہیں (بالخصوص) ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ نہایت قابلِ اعتماد ذریعۂ معلومات سمجھ کر پڑھتا ہے لیکن اس میں ان کا بھی کیا قصور ہے۔ جب ہم ان کے سامنے سچ نہیں رکھیں گے تو وہ ہر جھوٹ کو سچ تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گے۔

۳۔ صرف نام کی تبدیلی

ذیل کا اقتباس غور سے پڑھئے:-

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح معجزہ میں اسبابِ طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ براہِ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے

جیسا کہ قرآنِ کریم نے فرمایا ہے۔ وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ۔ اسی طرح کرامت میں بھی اسبابِ طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا براہِ راست حق تعالیٰ کی طرف سے کوئی کام ہو جاتا ہے۔ اور معجزہ اور کرامت دونوں خود صاحبِ معجزہ و کرامت کے اختیار میں بھی نہیں ہوتے ——— ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایسا کوئی خارقِ عادت کام اگر کسی صاحبِ وحی نبی کے ہاتھ پر ہو تو معجزہ کہلاتا ہے غیر نبی کے ذریعہ اس کا ظہور ہو تو کرامت کہلاتی ہے۔

یہ اقتباس ہے (مولانا) مفتی محمد شفیع (مرحوم) کی تفسیر (معارف القرآن) کا جو ماہنامہ البلاغ (کراچی) میں بالالفاظ شائع ہو رہی ہے۔ اس کا حوالہ ہے (البلاغ بابت مارچ ۱۹۷۷ء۔ صفحہ ۱۶) اس وقت بحث معجزہ کے متعلق نہیں۔ نقطۂ زیرِ غور صرف یہ ہے کہ ان حضرات کے نزدیک معجزہ دلیلِ نبوت ہوتا ہے۔ یعنی مدعی نبوت کے دعویٰ کی صداقت کا ثبوت۔ لیکن (مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ) اولیاءِ کرام سے جو کرامات سرزد ہوتی ہیں ان میں بھی اسبابِ طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے معجزہ اور کرامت کی کنہ اور حقیقت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ دونوں ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اس سے یہ سوال ابھرتا ہے کہ اگر معجزہ دلیلِ ثبوت ہوتا ہے تو کرامت دلیلِ نبوت کیوں نہیں ہو سکتی جبکہ حقیقت کے اعتبار سے دونوں ایک ہوتے ہیں۔

لیکن مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ نہیں۔ دونوں ایک جیسے نہیں ہوتے۔ نبی کے ہاتھ سے جو خارقِ عادت واقعہ ظہور میں آئے اسے معجزہ کہا جاتا ہے، اور غیر از نبی کے ہاتھ سے جو خارقِ عادت واقعہ رونما ہو اسے کرامت کہا جاتا ہے۔

کیا یہ وہ وہی بات نہیں جس کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ: اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ (…) ان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ یہ محض نام ہیں جو تم نے اور تمہارے اسلاف نے رکھ لئے ہیں! کیا (مفتی صاحب مرحوم کے ارشاد کے مطابق) معجزہ اور کرامت میں یہی فرق نہیں کہ ایک کو معجزہ کہہ کر پکارا جاتا ہے اور دوسرے کو کرامت۔ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ۔ (…) خدا نے ان ناموں کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی۔

محض ناموں کی تفریق سے یہ امت ہزار برس سے ایسی ایسی الجھنوں میں گرفتار چلی آ رہی ہے جن سے نکلنا اس کے بس میں نہیں (مثلاً) اللہ تعالیٰ نے کسی منتخب ہستی کو اپنی طرف سے براہِ راست علم عطا کرنے کا نام وحی رکھا تھا اور جسے یہ علم عطا ہوتا تھا اسے نبی یا رسول کہہ کر پکارا تھا۔ ختمِ نبوت سے خدا کی طرف سے اس طرح علم حاصل ہونے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لیکن بعد ازاں امت میں ایک عقیدہ رائج ہوا کہ (رسول اللہ کے بعد بھی) خدا کے برگزیدہ بندوں کو خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل ہوتا ہے۔ جب کہا گیا کہ یہ عقیدہ تو ختمِ نبوت کی نقیض ہے تو کہا کہ نہیں۔ اس سے ختمِ نبوت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اس لئے کہ نبی کو جو علم حاصل ہوتا تھا اسے وحی کہا جاتا ہے اور غیر نبی کو جو اسی نوع کا علم حاصل ہوتا ہے اسے کشف و الہام کہا جاتا ہے۔ اور جن برگزیدہ ہستیوں کو یہ علم حاصل ہوتا ہے، انہیں نبی نہیں، اولیاء کہا جاتا ہے۔ یعنی خدا کی طرف سے علم حاصل ہونے کی کیفیت اور نوعیت ایک ہی ہے لیکن اس کا نام الگ رکھ لیا گیا ہے۔ اس لئے اس سے ختمِ نبوت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

وہ جو "احمدیوں" اور ہمارے علماء میں نوے برس تک بحث کا سلسلہ جاری رہا اور بات کسی فیصلہ کن مرحلہ تک پہنچ نہ سکی تو اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ خود علماء حضرات، کشف و الہام پر عقیدہ رکھتے تھے اور کرامات اور پیش گوئیوں کے امکان کو تسلیم کرتے تھے۔ ان عقائد کے بعد فرق صرف ناموں کا رہ جاتا ہے۔ ان تمام الجھنوں کا حل ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کو سلطان تسلیم کیا جائے۔ یعنی جملہ عقائد و مسالک میں سند صرف قرآنِ کریم کی قابلِ قبول قرار پائے۔ اس کے بعد دیکھئے کہ کوئی پیچیدگی بھی باقی رہ جاتی ہے!

نقد و نظر

(۱) CONSPIRACIES AGAINST THE QURAN

ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب کی ذاتِ گرامی، حلقۂ طلوعِ اسلام میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ اس کی پیش کردہ قرآنی فکر سے ایک عرصہ سے منسلک چلے آ رہے ہیں، اور طلوعِ اسلام میں شائع شدہ ان کے مقالات ہر گوشے سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی مایۂ ناز کتاب — (PHENOMENA OF NATURE & THE QURAN)

پاکستان ہی میں نہیں، مغربی ممالک تک کے علمی اور تحقیقاتی حلقوں میں شرفِ قبولیت حاصل کر چکی ہے۔ اس اعتبار سے ڈاکٹر صاحب موصوف، بین الاقوامی شہرت سے سرفراز ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے، ڈاکٹر صاحب فن کے اعتبار سے ایک ممتاز مرجن ہیں، اور اس فن کے ماہرین جس قدر مصروف رہتے ہیں، بالخصوص جب وہ ڈاکٹر صاحب کی طرح نہایت دیانت اور امانت سے اپنی ذمہ داریاں سرانجام دیں، اس کا ہر ایک کو علم ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کو قرآنِ مجید سے جو عشق ہے، ان کی فنی مصروفیات اس کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتیں۔ وہ بدستور قرآنی تحقیقات میں منہمک رہتے ہیں۔ ان کے اس انہماک کا دوسرا ثمر، ان کی تازہ تصنیف کی شکل میں ہمارے سامنے آیا ہے جس کے لئے ہم ان کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس ذوق میں مزید برکت عطا فرمائے۔

زیرِ نظر تصنیف کا سرِ عنوان ہے: لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا آخَرَ — "اللہ حقیقی صرف اللہ ہے۔ اس کے ساتھ اور الٰہ شامل نہ کرو"۔ ڈاکٹر صاحب نے کتاب کے بابِ اوّل میں اِن خداوندانِ باطل میں سے ایک ایک کے چہرہ کو بے نقاب کیا ہے — خدا کے رسولوں کی پرستش۔ مذہبی پیشواؤں کی پرستش۔ اسلاف پرستی۔ فرقہ پرستی۔ روایات پرستی۔ پیر پرستی۔ مُردوں کی پرستش۔ ماضی پرستی۔ لیڈروں کی پرستش — غرضیکہ ہر قسم کی "گوسالہ پرستی" کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں کہ جب تک یہ راستے میں حائل رہیں، انسان، خدا کی عبودیت اختیار کر نہیں سکتا۔

دوسرے باب میں انہوں نے بتایا ہے کہ قرآنِ کریم یکسر حرکت و عمل۔ مسلسل جدوجہد۔ متواتر سعی و کاوش کا ضابطۂ ہدایت تھا۔ اس کے خلاف سازشوں نے اُمت کو عضوِ معطل اور پیکرِ بے روح بنا کر رکھ دیا ہے۔

تیسرے باب میں بتایا گیا ہے کہ دین کی بنیاد اس حقیقتِ کبریٰ پر ہے غل و غش یقینِ محکم پر ہے کہ قرآنِ کریم جو اُمت کے پاس ہے وہ کسی قسم کی کمی بیشی کے بغیر، حرفاً حرفاً وہی ہے جسے خدا نے رسولؐ پر نازل کیا اور حضورؐ نے جسے اُمت کو دیا۔ لیکن عجمی سازشوں نے اس میں تیسویں قسم کے شکوک و شبہات پیدا کر دیئے ـــــ وضعی روایات، تاریخ، تفاسیر، وغیرہ سب اسی سازش میں شامل ہیں۔ اس باب میں ان عناصر کی حقیقت بے نقاب کی گئی ہے۔

ایک باب میں اس سازش کا ذکر ہے جس کی رُو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ اسلام کو کوئی منفرد خصوصیت حاصل نہیں۔ سب مذاہب ایک سے ہیں۔ اکبر کے "دینِ الٰہی" سے لے کر (مولانا) ابوالکلام آزاد، (مرحوم) اور دیگر نیشنلسٹ لیڈروں کے "برہمو سماجی اسلام" تک سب اسی سازش کے مظاہر ہیں۔ اور آخر میں اس، سب سے زیادہ کامیاب سازش کا تفصیلی تذکرہ آ گیا ہے جس نے دین کی اصل و اساس تک کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ یعنی تصوف۔ اس میں تصوف کے بنیادی نظریات۔ اس کے معتقدات و مسالک۔ اس کی شاعری اور ادب، اور ان کے مجموعی نتائج و عواقب سے بحث کی گئی ہے۔ اس بحث میں ضمناً علامہ اقبالؒ کے تصوف سے متعلق نظریات پر بھی تنقید کی گئی ہے۔ اس ضمن میں ہم سردست اتنا عرض کرنے پر اکتفا کریں گے کہ علامہ نے قرآنِ کریم کی جس قدر خدمت کی ہے اس کے احساس سے سرِ تشکر جھکانے کے باوجود، ہم یہ کہنے میں قطعاً باک نہیں سمجھتے کہ وہ بہرحال ایک انسان تھے اس لئے ان کے کلام میں اگر کسی کو کچھ خلافِ قرآن نظر آ جائے تو اس پر تنقید کرنے کا اسے پورا پورا حق حاصل ہے۔ تصوف کے باب میں ان کے ہاں ایسی چیزیں ملتی ہیں جو قرآنِ مجید کی روشنی میں محلِ نظر ہیں اور ڈاکٹر صاحب نے انہی کو مرکزِ تنقید قرار دیا ہے۔

پرویز صاحب کی قرآنی فکر کو انگریزی خواں طبقہ تک پہنچانے کے تقاضے ہمیں مسلسل موصول ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے لئے ہم ان کی تصنیف (ISLAM A CHALLENGE To RELIGION) ہی کی سفارش کر سکتے تھے۔ اب ہم اس کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کی زیرِ نظر تصنیف بھی پیش کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی فطری کشادہ ظرفی کی بنا پر اس کتاب میں بھی اس حقیقت کا واضح الفاظ میں اظہار فرمایا ہے کہ ان کا یہ تصنیفی خرمن، پرویز صاحب کے فکری خوشوں کا رہینِ منت ہے۔ اس انداز کا اعتراف و اظہار بڑے بلند کردار کا متقاضی ہوتا ہے جو اس زمانے میں جنسِ نایاب ہوتا جا رہا ہے۔

کتاب بڑے سائز کے قریب دو سو صفحات پر مشتمل ہے اور نہایت عمدہ سفید کاغذ پر، پاکیزہ طباعت اور مقوّٰی جلد سے مزین ہے۔ گرانی کے اس زمانے میں، کتاب کے حسنِ صوری کے ایسے بلند معیار کو قائم رکھنے کے لئے بڑی ہمت اور حوصلہ درکار ہوتا ہے۔ قیمت فی جلد چالیس روپے۔ ملنے کا پتہ:۔

(۱) خالد پبلشرز۔ ۳۲۔ نسبت روڈ لاہور (۲) ادارۂ طلوعِ اسلام۔ گلبرگ ۲ لاہور

۲- اسلامی تصوّف میں غیر اسلامی نظریات

یہ کتابچہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کا تصنیف کردہ، اور ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی انجمن خدام القرآن سمن آباد، لاہور سے شائع کردہ ہے۔ یہ متوسط سائز کے قریب سوا سو صفحات پر مشتمل ہے۔ کاغذ سفید، طباعت گوارا۔ قیمت بلا جلد پانچ روپے۔

ہمارے ہاں ایک عجیب روش چلی آ رہی ہے۔ اسے ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ دو چار برس اُدھر، یہاں سوشلزم کا بڑا چرچا ہوا، جب "اسلام ہمارا دین" کہنے والوں نے "سوشلزم ہمارا معیشت" کا نعرہ بلند کیا۔ جب سوشلزم پر اسلامی نقطۂ نگاہ سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہوئی تو انہوں نے کہا کہ ہمارا سوشلزم "اسلامی سوشلزم" ہے۔ یعنی اس طرح سوشلزم کو دو قسموں میں بانٹ دیا گیا ـــــ ایک اسلامی سوشلزم اور دوسرا غیر اسلامی سوشلزم۔ حالانکہ سوشلزم، اسلامی ہو ہی نہیں سکتی۔ سوشلزم، سوشلزم ہے اور اسلام، اسلام۔ اس مثال سے آپ موضوع زیرِ نظر کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

دین کو خدا نے قرآن کریم میں مکمل کر دیا۔ اور اس کی عملی شکل کو الاسلام کہہ کر پکارا۔ کچھ عرصہ کے بعد، اسلام کے خلاف سازشیں شروع ہوئیں اور مختلف قسم کے معتقدات اور مسالک عین اسلام قرار دیئے جانے لگے۔ ان میں ایک اضافہ تصوّف کے نام سے بھی ہوا۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں "تصوّف اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا تھا" اور اپنی اصل کے اعتبار سے اسلام کی نقیض اور ختمِ نبوت کی مہر توڑنے کی بڑی لگن فریب کوشش۔ جیسا کہ ہم بکثرت لکھ چکے ہیں، نبوت سے مراد تھی خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہونا جسے وحی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ خدا کی طرف سے اس طرح علم آنے جانے کا سلسلہ حضورؐ رسالتمآب کی ذاتِ اقدس کے بعد ختم کر دیا گیا۔ اسے ختمِ نبوت کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تصوف کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل ہونے کا سلسلہ رسول اللہؐ کے بعد ختم نہیں ہو گیا، وہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اب جن حضرات کو یہ علم حاصل ہوتا ہے انہیں نبیؑ کے بجائے صوفیاء یا اولیاء کہا جاتا ہے، اور انہیں خدا کی طرف سے جو علم حاصل ہوتا ہے، اسے وحی کے بجائے کشف یا الہام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی اپنی اصل کی رو سے سلسلہ "نبوت" اب بھی جاری ہے۔ صرف نام بدل دیئے گئے ہیں۔ اب انبیاء کے بجائے اولیاء اللہ (یا مامورین من اللہ) اور وحی کے بجائے کشف و الہام۔

ان اربابِ کشف و الہام نے، (اس دعوے کی رو سے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں، خدا کی طرف سے دیئے گئے علم کی بنا پر ہے۔) اُمت میں اس قسم کی شطحیات۔ خرافات اور شرک و الحاد پر مبنی ہفوات پھیلائیں کہ توبہ بھلی۔ ان پر جب اعتراض کیا جاتا ہے تو حامیانِ تصوّف کی طرف سے یہ جواب ملتا ہے کہ یہ "غیر اسلامی تصوّف" کی باتیں ہیں۔ "اسلامی تصوّف" کو ان سے کچھ تعلق نہیں۔ یعنی وہ

تصوّف جو دوسروں سے مستعار لیا ہوا نظریہ تھا، اور جسے اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا، اسے اسلامی اور غیر اسلامی کی شقوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ تصوّف کے اجنبی پودے کی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جاتی ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب، اسی قسم کی کوشش کی مظہر ہے، اس میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب نے اولوالعزم صوفیاء کی کتابوں سے ایسے ایسے معتقدات کو چن چن کر اکٹھا کیا ہے۔ جن سے اسلام اپنی جڑوں تک سے کٹ جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ کہتے جاتے ہیں کہ اس قسم کی باتیں ان حضرات کی کتابوں میں بعد میں داخل کر دی گئی تھیں۔ تاریخی نقطۂ نگاہ سے، پروفیسر صاحب پر لازم آتا ہے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ، ان حضرات کی اوریجنل کتابوں میں یہ باتیں نہیں تھیں۔ انہیں ان میں بعد میں داخل کر دیا گیا تھا۔ ایسا کئے بغیر محض یہ دعویٰ کہ یہ بعد کے اضافے یا تحریفات ہیں، علم کی بارگاہ میں کیسے قابلِ قبول ہو سکتا ہے؟ اسے آپ قیاس کہہ سکتے ہیں۔ علم و یقین نہیں۔

پھر، اگر یہ باتیں اس قدر لغو اور خلافِ اسلام ہیں، اور ان حضرات کی طرف غلط منسوب تو کرنے کا کام یہ ہے کہ ان کتابوں کے ایسے ایڈیشن شائع کئے جائیں جن سے یہ تحریفات خارج کر دی جائیں۔ لیکن یہاں حالت یہ ہے کہ نہ تو تاریخی طور پر ثابت کیا جاتا ہے کہ یہ بعد کی تحریفات ہیں، اور نہ ہی ان کتابوں کو اس طرح شائع کیا جاتا ہے کہ وہ ان تحریفات سے منزہ ہوں۔

کتاب کی تقریظ میں (جسے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے قلمبند فرمایا ہے) کہا گیا ہے کہ پروفیسر چشتی صاحب، "تصوّف کے مخالفوں میں نہیں بلکہ اس کے پُرزور حامیوں میں سے ہیں"۔ پروفیسر صاحب نے لکھا ہے کہ "تصوّف دینِ اسلام کی روح ہے"۔ اور اس کے اجزائے ترکیبی یہ ہیں۔

(۱) توحیدِ خالص۔ (۲) تبلیغِ دین۔ (۳) اتباعِ شریعت۔ (۴) خدمتِ خلق۔ (۵) جہاد۔

ہم پروفیسر صاحب سے پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ کیا اسلام (یعنی قرآنِ کریم میں پیش کردہ دین) میں یہ اجزا موجود نہیں تھے جو اس کے لئے ایک نئے مسلک کی ضرورت لاحق ہو گئی؟ کیا تصوّف کے ان اجزا کے بغیر، دین ناقص رہ جاتا تھا جو اس کی تکمیل کے لئے ان اجزا کا اضافہ ضروری سمجھا گیا؟ اگر یہ سب کچھ اسلام میں موجود تھا تو پھر اس جدید نظریہ یا مسلک کو اختیار کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ قرآنِ کریم میں تو تصوّف یا صوفی کا لفظ تک نہیں آیا، اور جہاں تک ہماری نگاہ ہماری یاوری کرتی ہے، احادیث میں بھی یہ لفظ کہیں نہیں ملتا۔ پھر اس کے اضافہ کی ضرورت کیوں لاحق ہو گئی؟ اور اضافہ بھی ایسا جو بقول پروفیسر چشتی صاحب کے "دینِ اسلام کی روح" ہے! حیرت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسی اہم چیز کا اپنی کتاب میں ذکر تک نہ کیا، اور اس کے بغیر ہی اسے مکمل کر دیا؟ نہ ہی قرآنِ کریم میں کہیں کشف و الہام کا ذکر ہے اور نہ ہی کرامات کا۔ صحابہ کبارؓ میں سے بھی کسی نے ان کا دعویٰ نہیں کیا تھا، حالانکہ ان سے بڑھ کر "ولی اللہ" کون ہو سکتا تھا؟ لہٰذا یہ سب بدعات ہیں اور خدا کے مکمل دین میں انسانی اضافے۔

پروفیسر صاحب نے کہا ہے کہ اس قسم کی خلافِ اسلام باتیں بزرگوں کی کتابوں میں بعد میں ملا دی گئیں۔ انہی کو وہ "اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش" قرار دیتے ہیں۔ لیکن ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں جس سے اس دلیل کی کمزوری واضح ہو جائے گی۔ (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) ہمارے ہم عصروں میں سے ہیں۔ (ان کا چند سال ادھر انتقال ہوا ہے)۔ پروفیسر صاحب انہیں "شیخ الاسلام، آیۃ من آیات اللہ، مجاہدِ اعظم، حضرت سیدی و شیخی و مولائی سید حسین احمد مدنی قدس سرہ العزیز" کہہ کر پکارتے ہیں۔ (صفحہ ۲۴) مولانا مدنی (مرحوم) کے فرزندِ جلیل، مولانا اسعد میاں (جو ابھی بقیدِ حیات ہیں) ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ جب وہ سابرمتی جیل میں تھے تو وہاں ایک قیدی کو پھانسی کی سزا ہو گئی۔ اس نے ایک دوسرے قیدی، منشی محمد حسین کی معرفت، حضرت (مولانا حسین احمد) صاحب سے دعا کی درخواست کی۔

> منشی محمد حسین، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بہت سر ہوئے، فرمایا، اچھا جا کر اس سے کہہ دو کہ وہ رہا ہو گیا۔ منشی محمد حسین صاحب نے اس قیدی سے جا کر کہہ دیا کہ بابو! کہہ دیا کہ تو رہا ہو گیا۔ دو ایک روز گذرنے کے بعد اس قیدی نے پھر بے چینی کا اظہار کیا کہ اب تک کوئی حکم نہیں آیا، اور میری پھانسی میں چند ہی روز رہ گئے ہیں۔ منشی محمد حسین نے پھر آکر عرض کیا تو فرمایا کہ میں نے کہہ دیا کہ وہ رہا ہو گیا۔ اس کے بعد دو ایک یوم پھانسی کو رہ گئے تھے کہ اس کی رہائی کا حکم آ گیا۔
>
> (شیخ الاسلام نمبر صفحہ ۱۶۳۔ بحوالہ کتاب زلزلہ۔ لائل پور)

یہ واقعہ مولانا مرحوم کے صاحبزادہ کا بیان فرمودہ ہے۔ لہٰذا اس کے قابلِ اعتماد ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے۔ لیکن اگر اس سے بھی زیادہ مستند حوالوں کی ضرورت ہو تو مولانا مدنی (مرحوم) کی خود نوشت سوانحعمری "نقشِ حیات" ملاحظہ فرمایئے جس میں اس قسم کے متعدد واقعات ملیں گے۔

مذکورہ صدر واقعہ کی رو سے، مولانا مرحوم نے حتمی اور یقینی طور پر غیب کی بات بتا دی۔ یعنی قبل از وقت یقینی طور پر کہہ دیا کہ وہ ملزم رہا ہو گیا ہے۔ حالانکہ اسے پھانسی کی سزا ہو چکی ہوئی تھی۔ مولانا مرحوم کے ادعا کو قرآنِ کریم کی روشنی میں دیکھئے۔ اس میں غیب کے متعلق کہا گیا ہے کہ: اِنَّمَا الْغَیْبُ لِلّٰهِ (۱۰/۲۰) "غیب کا علم صرف خدا کے لئے ہے"۔ دوسری جگہ ہے۔ قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ۔ (۲۷/۶۵) "اے رسول! ان سے کہہ دو کہ اس کائنات میں غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں"۔ حتیٰ کہ (اور تو اور) خود حضور رسالتمآب بھی اعلان فرماتے تھے کہ: لَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ (۶/۵۰) "میں غیب کا علم نہیں رکھتا"۔ رسولوں کو بھی غیب کا صرف وہ علم حاصل ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ انہیں بذریعہ وحی عطا کر دیتا ہے۔ (۷۲/۲۶-۲۷ ؛ ۳/۴۴) قرآنِ کریم کی ان نصوصِ صریحہ کی رو سے، یہ واضح ہے کہ:

(۱) اگر کوئی شخص از خود غیب کے علم کا مدعی ہے تو وہ اپنے آپ کو خدا کا شریک ٹھہراتا ہے۔ اور

(۲) اگر وہ کہتا ہے کہ اسے یہ علم من جانب اللہ حاصل ہوا ہے تو وہ مدعیٔ نبوت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ غیب کا علم صرف حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو بذریعہ وحی عطا کیا جاتا تھا۔

ان تصریحات کی روشنی میں کیا پروفیسر صاحب فرمائیں گے کہ ان کے شیخ، آیۃ من آیات اللہ، مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے متعلق کیا سمجھا جائے!

پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ "قرآن نے شخصیت پرستی کا خاتمہ کر دیا" (ص۱۴) لیکن مسلمانوں میں شخصیت پرستی اس حد تک رائج ہو گئی کہ "جو کتاب بھی یا جو شعر بھی کسی ولی اللہ یا امام کی طرف منسوب ہو جائے، کسی مسلمان میں اس پر تنقید کی جرأت نہیں ہو سکی" (ص۷۶) اور اس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ پروفیسر صاحب نے دیگر صوفیا کی کتابوں پر تو تنقید کی ہے لیکن اپنے شیخ کی طرف وہ آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت بھی نہیں کر سکے۔ اس شخصیت پرستی کا ایک اور واقعہ بھی ہمارے سامنے آ گیا۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ ۱۹۳۸ء میں مولانا مدنی (مرحوم) نے (جو پکے نیشنلسٹ تھے) کہا تھا کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ اس پر علامہ اقبالؒ نے پہلے چند اشعار کہے تھے جن کا ایک مصرعہ اب تک فضا میں گونج رہا ہے کہ — چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است — تشکیلِ پاکستان کے بعد، تحریکِ پاکستان کی تاریخ کے سلسلہ میں اس واقعہ کو اکثر و بیشتر دہرایا جاتا تھا۔ پروفیسر یوسف سلیم صاحب کے لئے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی کہ ایسے حقائق بیان کئے جائیں جن سے ان کے پیرو مرشد کی شانِ اقدس پر حرف آتا ہو۔ چنانچہ انہوں نے ماہنامہ میثاق کی فروری و مارچ ۱۹۷۲ء کی اشاعتوں میں ایک مقالہ شائع کیا جس میں کہا کہ علامہ اقبالؒ کے اعتراض کے جواب میں، مولانا مدنی، (مرحوم) نے جب اپنے بیان کی وضاحت کی تھی تو اس سے علامہ اقبالؒ مطمئن ہو گئے تھے اور یوں وہ قصہ رفع دفع ہو گیا تھا۔ لہٰذا اب اس کا ذکر نہیں کرنا چاہیئے۔ ہم نے طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت اپریل ۱۹۷۲ء میں اس کا مؤاخذہ کیا اور لکھا کہ چشتی صاحب کو مولانا مدنی (مرحوم) کا وہ بیان تو یاد رہا لیکن وہ کتابچہ یاد نہ آیا جسے مولانا مرحوم نے علامہ اقبالؒ کی وفات کے چھ ماہ بعد شائع کیا تھا، اور اس میں کہا تھا کہ اقبالؒ کا نظریہ باطل تھا اور جو کچھ میں نے کہا تھا وہ حق تھا۔ وہ قومی نظریہ خلافِ اسلام ہے اور متحدہ قومیت کا نظریہ عین مطابقِ کتاب و سنت۔ چشتی صاحب نے اس کتابچہ کا ذکر تک نہ کیا۔ قارئین کے اصرار پر ہم نے اسے طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۷۵ء میں شائع کیا تھا۔ چشتی صاحب کے لبوں پر اس کے بعد مہرِ خاموشی لگ گئی۔ لیکن حضرت مدنی، ان کے نزدیک بدستور، آیۃ من آیات اللہ اور مجاہدِ اعظم رہے۔ یہ ہے وہ شخصیت پرستی جسے تصوف پیدا کرتا ہے۔

یاد رکھئے! خدا کی طرف سے عطا کردہ دین، قرآنِ مجید میں تکمیل تک پہنچ گیا اور اس کے عملی نظام کا نام خود خدا نے الاسلام رکھ دیا۔ اس کے بعد، نہ دین میں کسی الحاق اور اضافہ کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی چار یار مسلک کی حاجت۔ قرآن، خدا کی آخری کتاب۔ محمد رسول اللہؐ اس کے آخری نبیؐ۔ الاسلام، اس کا نظام۔ اور اس پر عمل پیرا ہونے والوں کا نام مومن یا مسلم — یہ ہے الدین۔ باقی سب آمیزشیں ہیں۔ جب تک ان آمیزشوں کو الگ نہیں کیا جاتا، الدین کا خالص تصور سامنے نہیں آ سکتا۔

اسلام کو علم و بصیرت کی روشنی میں سمجھنے کے خواہشمندوں کیلئے

انقلاب انگیز * بصیرت افروز * عہد آفریں * معلومات افزا * کتابیں

لغات القرآن

یہ قرآن الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں۔ یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کیا ہے۔ اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ۔ چار جلدیں۔

قیمت فی جلد پچیس روپے (علاوہ محصول ڈاک)

سلیم کے نام خطوط

ہمارا تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ ایک عجیب کشمکش میں گرفتار ہے اسلام کے متعلق اس کے دل میں سینکڑوں شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں لیکن اسے ان کا کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ جب وہ اس طرح مذہب سے متنفر ہو جاتا ہے تو ہم اسے کوسنے لگ جاتے ہیں۔ اسے کوسئے نہیں۔ یہ کتاب دیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ کس طرح صحیح اسلام کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ خطوط کا انداز بڑا دلکش اور ہلکا پھلکا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ کاغذ۔ مجلد تین جلدیں۔ قیمت فی جلد بارہ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

انسان نے کیا سوچا؟

کیا تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت کر سکتی ہے؟ اس اہم اور پیچیدہ سوال کا جواب، یونان کے فلاسفروں سے لے کر ہمارے زمانے کے مفکرین اور سائنسدانوں نے کیا دیا ہے؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے مستغنی کر دے۔ بڑی تقطیع۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ۔ قیمت مجلد بیس روپے۔ (علاوہ محصول ڈاک)

اسلام کیا ہے؟

یہ مسئلے مسائل کی کتاب نہیں۔ یہ آپ کو بتائے گی کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشرتی، معاشی، سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور اس کی غرض و غایت کیا۔ اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے۔

قیمت اعلیٰ ایڈیشن پندرہ روپے۔ سستا ایڈیشن آٹھ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

جہانِ فردا

مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ زندگی کن مراحل سے گذریگی؟ قیامت، حشر نشر، میزان، جنت، جہنم کا قرآنی مفہوم کیا ہے؟ اس دنیا کا اس دنیا کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ مُردوں کیلئے ایصالِ ثواب کی حقیقت کیا ہے؟ یہ اور اسی قسم کے دیگر متعدد سوالات کے بصیرت افروز جوابات۔

قیمت مجلد پچیس روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

ملنے کا پتہ

مکتبۂ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

ضروری اعلان

ادارۂ طلوعِ اسلام سے خط وکتابت و ترسیلِ منی آرڈر، رجسٹری، پارسل، چیک، ڈرافٹ، اور ان سے متعلقہ لفافوں پر پتہ میں صرف

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام

(۲۵ - بی - گلبرگ ۲ - لاہور)

لکھیں۔ کسی کا نام نہ لکھیں۔ کیونکہ اس سے بسا اوقات دقتیں پیش آجاتی ہیں۔ نوٹ فرمالیں۔

(ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام)

ضرورتِ رشتہ

ایک برٹش نیشنل پاکستانی، تعلیم یافتہ، کاروباری ایگزیکیٹو کے لئے جو ایک کاروباری ادارہ کا مالک ہے، ایک مسلم تعلیم یافتہ خوش اخلاق، دراز قد اور اچھی شخصیت کی لڑکی کا رشتہ درکار ہے۔ ذات پات و شہریت کی کوئی قید نہیں۔

خط وکتابت بصیغۂ راز۔

م - ح - ل

معرفت ناظم

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/ بی - گلبرگ ۲ - لاہور

ضروری تصحیح

طلوعِ اسلام کے شمارہ مارچ ۱۹۷۷ء کے صفحہ ۸، جز ۳ میں "معاشرہ کے ذمہ نہ ہوگا" کے بجائے "معاشرہ کے ذمہ ہوگا" پڑھیں۔ (ناظم ادارہ)

قائدِ اعظمؒ کے متعلق اور تو سب کچھ بتایا جائے گا لیکن یہ بہت کم بتایا جائے گا کہ انہوں نے اسلام، قرآن اور اسلامی مملکت کے متعلق کیا فرمایا تھا۔ ان کے یہ ارشادات ایک پاکٹ سائز بک لٹ

قائدِ اعظمؒ اور طلوعِ اسلام

میں نہایت حسن وخوبی سے جمع اور مرتب کر دیئے گئے ہیں۔ اس قسم کا بیش بہا ذخیرہ آپ کو اور کہیں نہیں ملے گا۔

قیمت صرف چار روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ادارۂ طلوعِ اسلام - گلبرگ ۲ لاہور

اسبابِ زوالِ امت

اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے لیکن کچھ عرصہ سے نایاب تھی۔ اس کا تازہ ایڈیشن حال ہی میں شائع کیا گیا ہے۔ اس میں اس اہم اور بنیادی سوال کا نہایت حقیقت کشا جواب ملے گا کہ

"ہم ذلیل کیوں ہوئے"

جلدی منگوا لیجئے کیونکہ اس کے ایڈیشن جلدی ختم ہو جایا کرتے ہیں۔ قیمت صرف چار روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ

مکتبۂ دین و دانش - چوک اردو بازار لاہور